# شاعراتِ ارضِ پاک

(حصہ ششم)

(تنقیدی مضامین و منتخب کلام)

شبیر ناقدؔ

رنگِ ادب

نگرانِ اشاعت

**شاعر علی شاعر**

**0345-2610434**

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ

| | |
|---|---|
| کتاب | شاعراتِ ارضِ پاک (جلد ششم) |
| مصنف | شبیر ناقد (0333-5066967) |
| اشاعت | مئی ر 2015ء |
| کمپوزنگ | شیرازی شاعر |
| ناشر | رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی |
| ای میل | rangeadab@Yahoo.com |
| تعداد | 500 |
| صفحات | 160 |
| قیمت | 500/= روپے |

پبلی کیشن کی جدید ٹیکنالوجی کے مطابق کتاب کی اشاعت کے لیے رابطہ کیجیے

**رنگِ ادب پبلی کیشنز**

5۔ کتاب مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

# فہرست

ا ں نجمِ سحر — ابوالبیان ظہور احمد فاتح — 05

ا ں عصری شعری مسائل — شبیر ناقد — 08

## مضامین:

ا ی بسمل صابری روایت وجدت کا سنگم — 11

ا ی پروین شاکر احساسِ محبت کے آئینے میں — 19

ا ی ذکیہ غزل کی خلوص پرور غزل — 27

ا ی رخشندہ نوید محبت کے موسموں کی شاعرہ — 33

ا ی رضیہ فاروقی کا رنگِ تسلیم ورضا — 40

ا ی ریحانہ روحی کے شعری تجربات — 45

ا ی ڈاکٹر زاہدہ تسنیم کی حقیقت پسندانہ شاعری — 51

ا ی زاہدہ رئیس راجی کا حقیقت پسندانہ سخن — 56

ا ی شبنم شکیل کے عمرانی رویے — 61

ا ی صالحہ کوثر کا صد رنگ سخن — 66

ا ی ڈاکٹر صغرا صدف کا تخلیقی وجدان — 71

ا ی ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی آس سخن وررد ورنج — 76

ا ی طلعت اشارت کے شعری ادراکات — 81

ا ی عابدہ نکہت کا پندارِ ذات — 87

ا ی عظمیٰ صدیقی رجائی احساسات کے آئینے میں — 91

ای غزل انصاری کے فکری زاویے 97
ای فہمیدہ ریاض کی نظم اور غیر روایتی تخیلات 102
ای کشور ناہید کے شعری رجحانات 107
ای کومل جوئیہ بے باک لہجے کی شاعرہ 112
ای گل زیب زیبا کا کلام اور عصری آشوب 118
ای ناہید شروانی کی رویوں کی عکاس غزل 124
ای نجمہ انصار نجمہ کا فکری تنوع 129
ای نسرین نکہت سبزواری کے فکری رجحانات 134
ای نگہت عائشہ کا رنگِ سخن 141
ای ہما اعظمی اور عصری رویے 148
ای شبیر ناقد کے سوانحی وفنی کوائف پر طائرانہ نظر 154

◆

# نجمِ سحر

### ابوالبیان ظہور احمد فاتح

صانعِ لوح و قلم کے احسانات کا کوئی بدل نہیں جس نے دل و دماغ اور نطق و ذہن جیسے قوائے رئیسہ سے ابنِ آدم کو مزین کر دیا پھر اُسے ضمیر و شعور کے اُجالوں سے ہمکنار کیا مزید برآں اُس ذاتِ کریم نے فنونِ لطیفہ کی ایجاد و قدر دانی کے جواہر زریں عطا کیے اس پر مستزاد یہ کہ تفہیم و انتقاد کی صلاحیتوں سے بہرہ ور فرما دیا۔

عالمِ رنگ و بو مرد و زن کا مرکب تام ہے اگر مرد پیکرِ قوت و جلال ہے تو عورت مجسمۂ نازش و جمال ہے ایک وقت تھا کہ مرد حضرات کو بہت سے میدانوں میں اجارہ داری حاصل تھی اور طبقۂ اناث گوشہ گیر ہو کر رہ گیا مرورِ ایام نے جہاں اور بہت کچھ بدل کر رکھ دیا ہے وہاں یہ نوبت بھی ضرور آئی ہے کہ معشر ذکور کی دست برد میں رفتہ رفتہ کمی واقع ہوتی چلی گئی اور اُس کے مفتوحہ میدانوں پر بنتِ حوا فائز و متصرف ہوتی چلی گئی نوبت بایں جا رسید کہ اب وہ خم ٹھونک کر تقابل و تجادل پر اتر آئی ہے بلکہ اپنے مکمل حقوق کے لیے صدا لگانے لگی ہے اور ہمیں اُس کی اس بات سے قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ ہماری انصاف پسند طبیعت اُس کی حوصلہ افزائی پر قائل و مائل ہے۔

فنونِ لطیفہ کے بہت سے شعبے ہیں مثلاً تعمیرات، موسیقی، مصوری اور شاعری وغیرہ اپنے نزدیک موخر الذکر شعبہ یعنی شعر و سخن بے حد عظمت و اہمیت کا حامل ہے جو شخص حرمتِ حرف سے

وابستہ ہو جاتا ہے اُسے خلوص و اعتبار کا وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ دلوں پر راج کرنے لگتا ہے اور لسانِ واصفین اُن کی مدح و ستائش کرتے نہیں تھکتے اُن کے پیغام کو غور سے سنا جاتا ہے اور دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اُسے جگہ ملتی ہے کچھ عرصہ قبل تک صنفِ نازک کو محدود رسائی یہاں تک حاصل تھی کچھ تو اس کی اپنی شرمیلی طبیعت اس کی متحمل نہیں تھی اور کچھ حرفِ ملامت گراں گزرتا تھا البتہ یہ فرق ضرور تھا کہ عرصۂ ماقبل میں ایسی جرأتِ رندانہ کرنے والی خواتین جابر مردوں کی چیرہ دستی کا شکار ہو جاتی تھیں آج کا بزعمِ خویش ملکیتِ قاہرہ کا دعویٰ رکھنے والا فرزندِ آدم دل ہی دل میں احساسِ ناگواری اور اظہارِ بیزاری ضرور رکھتا ہے بلکہ کبھی کبھی حرفِ احتجاج بھی اُس کی زبان پہ آ جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی بیوی، بہن یا بیٹی کے بطور شاعرہ منصۂ شہود پر آنے کو اپنے لیے سبکی سمجھتا ہے تاہم بدلتے ہوئے حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو شاعراتِ گرامی قدر کو بستانِ سخن کی عنادل قرار دیتے ہیں اور قریباً ایسے ہی احساسات ہمارے تلمیذِ عزیز شبیر ناقد بھی رکھتے ہیں جس کا منہ بولتا ثبوت ایک بھرپور سلسلۂ کتب "شاعراتِ ارضِ پاک" کے نام سے قبولِ عام کا درجہ حاصل کر رہا ہے قبل ازیں اس سلسلے کی پانچ جلدیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور یہ چھٹی جلد اب آپ کے خوب صورت ہاتھوں میں ہے جسے ہم نقادِ موصوف کی جودتِ طبع کا کرشمہ قرار دے سکتے ہیں۔

شبیر ناقد خود ایک معروف شاعر بھی ہیں اور کاروارِ تنقید سے بھی گہرا علاقہ رکھتے ہیں اُن کی سخن شناسی مسلمہ ہے وہ فنِ تنقید اور انتقادی نفسیات سے بخوبی آگاہ ہیں عصری تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور فنی تلازموں سے بھی مکمل آشنائی رکھتے ہیں۔

ہم سخن فہم بھی ہیں اور سخن سنج بھی ہیں
گیت بلبل کوئی گائے تو غزل کہتے ہیں

کے بمصداق شبیر ناقد خدمتِ لوح و قلم کرتے ہوئے کبھی خود مشقِ سخن کرتے ہیں تو کبھی خدامِ سخن کو دادِ فن دیتے نظر آتے ہیں ذرا کان ہماری طرف کیجیے سرگوشی کے انداز میں راز کی ایک بات آپ کو بتا رہے ہیں لیکن کسی اور کو بتائیے گا نہیں وہ یہ کہ شبیر ناقد جی تنقید کے ذریعے جراحتِ دل نہیں بلکہ دلداریِ جاں کا فریضہ انجام دیا کرتے ہیں چچا غالب نے کہا تھا۔

عاشق ہو پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

قارئینِ کرام ایسا ہنر جو باعثِ دل بستگی بھی ٹھہرے اور جواب ہنر بھی ہو جس میں قلم کار کے سرمایۂ فکر و فن کو نہ صرف سند عطا کی جائے بلکہ اسے اس پر دادِ تحسین بھی دی جائے تو یہ امر بہت مسرت آگیں ہے خصوصاً ہمارے سماج کا ایک محروم و مظلوم طبقہ جو ایک عرصہ تک محکوم بھی رہا ہے اگر لائقِ اکرام و اعزاز ٹھہرے تو کتنی خوشی کی بات ہے سیانے سچ کہہ گئے ہیں:

دل بدست آور کہ حج اکبر است

یہاں ہم ایک اور فرہادِ صفت انسان کا ذکرِ خیر نہ کرنا نا انصافی کے مترادف سمجھتے ہیں اور وہ ہیں عظیم ناشر شاعر علی شاعرؔ جو خود ایک قد آور شاعر بھی ہیں ایک سچے خادمِ ادب بھی ہیں اور ایک با اصول ناشر بھی ان کا ادارہ رنگِ ادب پبلی کیشنز یقیناً لائقِ ستائش ہے جسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ بہت سی ادبی تصانیف کی اشاعت کا سہرا اس کی ادارت و اشاعت کا افتخار بھی اسے حاصل ہے ہماری دعا ہے کہ جناب شاعر علی شاعرؔ کا یہ چمنستان پھلا پھولا رہے اور ان دونوں حضرات کو خدمتِ ادب کی فزوں سے فزوں تر توفیقات حاصل رہیں۔

(آمین ثم آمین)

# عصری شعری مسائل

عصرِ حاضر میں جہاں اچھا شعر تخلیق ہو رہا ہے وہاں بے جان، بے روح اور سپاٹ قسم کی شاعری کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں بلکہ موخر الذکر شعرا و شاعرات کا تناسب اوّل الذکر سے کچھ زیادہ ہی ہے نوبت بہ ایں جا رسید کہ دو سو صفحات کا شعری مجموعہ ملاحظہ کریں تو اس میں سے پانچ اشعار ایسے ہوں گے جو شرفِ انتخاب پائیں گے ان پانچ اشعار میں بھی تین اشعار محض رواداری کا نتیجہ ہوں گے بقیہ دو شعری بھی مسندِ انتخاب پر براجمان ہوتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کریں گے عصری تنقیدی روش میں مروتوں کو اس لئے فروغ میسر ہے کہ انہیں بھرپور انداز میں سراہا جاتا ہے کیونکہ حقیقی تنقید جسے یارانِ جہاں منفی تنقید سے موسوم کرتے ہیں کی تاب لانے کا کسی میں یارا نہیں ہے عصری تنقید ایک بانجھ شجر کی مثیل بن گئی ہے جس پر کوئی ثمر نہیں لگتا بلکہ صرف ایک جملے کے گرد طواف کر رہی ہے کہ من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر ناقدانِ شعر کلاسیکی تخلیقی و تنقیدی اور تحقیقی ورثے سے محروم ہیں لسانِ اردو کی تین بڑی اشتراکی زبانوں ہندی، فارسی اور عربی سے ان کا دامن تہی ہے لسانی اور فنی ادراکات سے عاری ہیں موزونیت کے علم جسے علم العروض کا نام دیا جاتا ہے سے نا آشنا ہیں علمِ بدیع جسے علمِ بیان سے بھی معنون کیا جاتا ہے سے نابلد ہیں جنہوں نے زندگی میں کوئی شعر موزوں نہیں کیا وہ تخلیقِ شعر کے نقد و نظر کے حوالے سے فیصلے صادر فرما رہے ہیں یہ معاملات حضرات و خواتین دونوں کے ہاں پائے جاتے ہیں لیکن خواتین جن میں فطری فکری و فنی بالیدگی کی نسبت قدرے کم ہے ان کے ہاں یہ معاملہ زیادہ گھمبیر نوعیت کا ہے شاعرات کے کلام کی تحقیق و تنقید کے دوران ہمیں اکثر یہ محسوس ہوا

کہ فکری و فنی بلوغت ان سے گریزاں ہے اور اس سلسلے میں خاطر خواہ رسائی حاصل کرنے کی سعی مشکور نہیں کی گئی کیونکہ اس امر کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی ان کے مجموعوں کے نام عمومی اور سطحی فکر کے حامل ہوتے ہیں جن میں کسی نوع کا رفعت آمیز تاثر معدوم ہوتا ہے اور کلام میں معائبِ سخن کا وفور نظر آتا ہے متروکات کے استعمال کو عار نہیں سمجھا جاتا تنافرِ حرفی چاہے وہ جلی نوعیت کا ہو یا خفی حیثیت کا شعر کی زینت بنا دیا جاتا ہے ضائع بدائع، رموز و تائع، تشبیہات و ترکیبات خال خال اور محاورات و استعارات عید کے چاند کی طرح نظر آتے ہیں جن آموزگارانِ سخن سے وہ مشاورتِ شعر کرتی ہیں وہ غزل میں تو جیسے تیسے کر کے عروضی ارکان پورے کر دیتے ہیں لیکن آزاد نظم میں عروضی ارکان کی تعدادی مغائرت پائی جاتی ہے کسی سطر میں دو رکن ہوتے ہیں تو کسی میں پانچ ارکان ہوتے ہیں تو کسی میں ڈیڑھ رکن ہوتا ہے فنی چابکدستی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اس لیے ان کی آزاد نظم یا تو نیم آزاد ہو جاتی ہے یعنی کہیں کہیں لاشعوری یا شعوری طور پر عروضی تلازمات کا اہتمام ہوتا ہے جب کہ کہیں عروضی ارکان یکسر مفقود ہو جاتے ہیں یوں وہ نیم آزاد یا نظمِ منثور بن جاتی ہے شاعرات و شعرا کے شعری مجموعوں میں یہ بھی اکثر مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ادبی حوالے سے مشہور و معروف شخصیات سے مقدمہ جات، تنقیدی شذرات یا تاثرات لکھوائے جاتے ہیں جو بے بنیاد تعریفوں کے پل باندھ دیتے ہیں حالانکہ جس کتابِ شعر کے حوالے سے وہ رقمطراز ہوتے ہیں اسی میں بہت سے اشعار ساقط الوزن اور خارج از بحر ہوتے ہیں ان کے کھوکھلے تعریف و توصیف کے پل جہاں ممدوحان کے خلاف تاثر پیدا کرتے ہیں وہاں متعلقہ ناقدانِ فن کی فنی بساط کا بھی مذاق اڑا رہے ہوتے ہیں شعری معیار کے حوالے سے کلاسیکی مفروضہ یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کی ہر غزل سے دو یا تین عمدہ اشعار برآمد ہوں تو وہ اچھا شاعر ہے جبکہ آج کل معاملہ بالکل برعکس ہے کہا جاتا ہے کہ اگر کسی شاعر یا شاعرہ کے شعری مجموعہ سے دو یا تین اچھے اشعار نکل آئیں تو وہ لائقِ تحسین ہے شاعرات کے ساتھ یہ سلوک ناروا بھی ہوتا ہے کہ احباب غیر حقیقی داد و تحسین کے ڈونگرے محض اس لیے برساتے ہیں کہ موصوفہ ناراض نہ ہو جائیں کیونکہ تعلقات کے خراب ہونے کا احتمال ہوتا ہے س لیے انھیں ان کے عیوبِ سخن باور نہیں کرائے جاتے جس کے باعث وہ بے معنی احساسِ برتری میں مبتلا ہو جاتی ہیں اکثر احباب شعر جن میں

حضرات و خواتین شامل ہیں میں لایعنی ادبی برتری کا زعم پروان چڑھتا رہتا ہے حتیٰ کہ ان کا یہ رویہ میر و غالب کے تعلیاتی افکار کی حدود و قیود کو بھی پھلانگنے لگتا ہے نہ فن پر دسترس ہوتی ہے نہ فکری بالیدگی اس کے باوجود اپنے حوالے سے حقیقی رائے قائم کرنے سے قاصر ہوتے ہیں حالانکہ داخلی طور پر ہر سخنور کو اپنے فکری و فنی ادراکات کا شعور ہوتا ہے لیکن خارجی طور پر اس امر کا اعتراف نہیں کیا جاتا حالانکہ اس امر کی اشد ضرورت ہے یوں غیر جانبداری کی فضا میں شاعری کو پنپنے کا موقع میسر نہیں آتا جملہ اہلِ ادب اور ارباب نقد و نظر سے مؤدبانہ التماس ہے کہ خدارا کچھ ادب پر بھی ترس کھائیں اور اپنے حالِ زار پر بھی رحم کریں یوں شعری اور تنقیدی فضا کو مکدر کرنے کی سعیِ نامشکور سے گریز کریں ہمارے تنقیدی معروضات خالصتاً فنِ شعر اور نقدِ فن شعر کے ضابطوں کی پاسداری کے ضمن میں تھے امید ہے کہ قارئین بھی انھیں ایک فنی بحث پر محمول کریں گے اور ارباب نقد و شعر بھی انھیں اپنی دل آزاری کا سامان خیال نہیں کریں گے۔

**شبیر ناقدؔ (تونسہ شریف)**

فون نمبر:۔ 0333-5055957

○

# بسمل صابری روایت و جدت کا سنگم

ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا ''عظیم شاعری روایت سے جڑی ہوتی ہے'' روایت تہذیبی و ثقافتی عوامل کے زیرِ اثر ہوتی ہے جس میں جغرافیائی خصوصیات بھی شامل ہوتی ہیں تخلیق کار کا اپنی دھرتی سے تعلق مضبوط بنیادوں پر قائم ہوتا ہے اس لیے اس کی تخلیقات میں اپنی دھرتی کے رنگ ہوتے ہیں اور اس کی بوباس رچی بسی ہوتی ہے اگر کسی سخن گستر کا روایت سے کوئی تعلق نہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اُس کے افکار و خیالات بنیاد سے محروم ہیں اور اُسے ہم فطری شاعر نہیں کہہ سکتے کیونکہ روایت کسی بھی سخنور کے کلام میں فطری طور پر رچی بسی ہوتی ہے بہت سے شعراء و شاعرات جدت کے زعم میں اپنے کلام کو لایعنی خیالات کا پلندہ بنا لیتے ہیں اُن کی فکر اور اُن کا اسلوب جاذبیت کی دولت سے یکسر محروم ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو عظیم جدت پسند کہلوانے کے زعم میں مبتلا ہوتے ہیں وہ شعری لطافتوں اور نزاکتوں سے یکسر نابلد ہوتے ہیں اُن کے پاس لطیف جذبات و احساسات کا فقدان ہوتا ہے وہ ایک بے جان اور بے روح قسم کا کلام تخلیق کر رہے ہوتے ہیں وہ سپاٹ قسم کے اسلوب کے ساتھ ساتھ اپنی فکر کو بھی سپاٹ کر رہے ہوتے ہیں جو سخن دان صحیح معنوں میں جدت و ندرت کے حامل ہوتے ہیں وہ انھیں اپنی فہرست کے آخری سیریل پر بھی برداشت کرنے کے روادار نہیں ہوتے اُس شاعری کو معیاری کلام نہیں کہا جا سکتا جدت کی بنیاد روایت ہے اور جس جدت کی بنیاد ہی نہ ہو چہ معنی دارد:

جدت سے مراد یہ ہے کہ تشبیہات و تراکیبات جدید نوعیت کی حامل ہوں استعارات میں تنوع ہو اسلوب میں ایک نیا رنگ، ڈھنگ اور افکار نادرالنظیر ہوں لغت میں بھرپور قسم کا تاثر ہو

روایت سے مطابقت یا اختلاف ہو جملہ امور جاذبیت سے معمور ہوں جدت کا ایک روپ یہ بھی ہے ”اک رنگ کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھو“ علیٰ ہذا القیاس عصری رجحانات و میلانات سے ہم آہنگ اندازِ سخن کہا جا سکتا ہے جس میں جدت پر بدعت کا گماں نہ ہو روایت و جدت کا حسین امتزاج ایک عمدہ اور معیاری شاعری کو جنم دیتا ہے۔ آوازوں کے اس ہجوم میں بہت کم شعراء اور شاعرات اس نوع کی پہچان رکھتے ہے شاعرات کی کھیپ میں بہت کم شاعرات ہیں جو نمایاں طور پر سامنے آئی ہیں ان میں سے بسمل صابری کا نام نامی بھی خاص اہمیت رکھتا ہے جن کا شعری سفر نصف صدی پر محیط ہے۔ وہ دنیائے اردو میں اپنی ایک شعری پہچان رکھتی ہیں اور پاک بھارت کی ہر دل عزیز شاعرہ ہیں ہم نے جب ان کے شعری مجموعہ ”پانی کا گھر“ اور ”روشنیوں کے رنگ“ کا مطالعہ کیا تو ہمیں ان کے شعری مزاج میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج نظر آیا ان کے اوّلین شعری مجموعہ ”پانی کا گھر“ جو 1998ء میں منصۂ شہود پر آیا جس نے بے پناہ داد و تحسین کی دولت سمیٹی۔ 2008ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا اس مجموعے کا یہ شعر اتنا مقبول ہوا کہ زبان زدِ عام ہو گیا ؎

وہ عکس بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

مجموعہ ھٰذا میں زیادہ تر غزلیات، کچھ آزاد منظومات، قطعات اور نمونے کے گیت شامل ہیں۔

شذرہ ھٰذا میں ہم ان کے دوسرے شعری مجموعہ روشنیوں کے رنگ مطبوعہ 2011ء کے منتخب غزلیہ اشعار کا فکری و فنی تجزیہ روایت و جدت کے تناظر میں کریں گے۔ ان کے اس مجموعہ میں بھی زیادہ تر غزلیات، چند پابند منظومات نمونے کے گیت اور کچھ قطعات شامل ہیں ان کے اس شعری مجموعے کے حوالے سے فرخ سہیل گوئندی، علی سردار جعفری ڈاکٹر خورشید رضوی، پروفیسر سہیل اختر (چیف ایڈیٹر سہ ماہی فراست بہاولپور) ڈاکٹر کنول فیروز (چیف ایڈیٹر ماہنامہ شاداب لاہور) اظہر جاوید (مدیر اعلیٰ ماہنامہ تخلیق لاہور) پروفیسر اکبر شاہ، جعفر شیرازی اور پروفیسر حسن عسکری کاظمی جیسے عظیم المرتبت اربابِ دانش کی غیر منظوم آرا شامل ہیں علاوہ ازیں ان

کے حوالے سے راغب مرادآبادی جیسے جلیل القدر شاعر کی آرا، قلم برداشتہ قطعات پر مبنی ہیں بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔

موجودہ عصری حالات میں دہشت گردی نے بھیانک صورتِ حال اختیار کر لی ہے دہشت گردی کی نوعیات میں تنوع پایا جاتا ہے اس کی کئی صورتیں ہیں جو تمام تر کرب انگیز ہیں دہشت گردی کی ایک صورت تو دھماکوں کی صورت میں ہے جس میں بہت سے افراد آنکھ جھپکتے ہی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ یہ دہشت گردی کی کلاسیکی صورت ہے جس سے کوئی انسان محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جس کا نشانہ پیر و جواں بچے اور عورتیں بھی بنتی ہیں اس سماجی کرب کی غمازی اُن کی غزل کے اس شعر میں دیدنی ہے ؎

لو بیبیاں بھی دھماکوں کی زد سے بچ نہ سکیں
چھپے ہیں درد رداؤں میں دیکھ لو آ کر

جہاں اُن کے کلام میں سماجی رویے موجود ہیں وہاں سماجی کرب بھی فکر انگیز اور درد خیز انداز میں پایا جاتا ہے اُن کے افکار میں ایک ہمہ گیری اور پہلو داری پائی جاتی ہے۔ اُن کے خیالات آفاقیت کے مظہر ہیں انھوں نے اپنی غزل کے ایک شعر میں ایک روایتی المیے کو یوں روایتی انداز میں بیان کیا ہے ؎

سوچو ذرا وہ زیست کو کیسے بسر کریں؟
جو لوگ آج بھوک سے اتنے نڈھال ہیں

اسی حوالے سے راقم الحروف اپنی غزل کے دو اشعار میں کچھ یوں گویا ہیں ؎

دن بھی کرب سے میرا گزرا
شب بھر مجھ کو نیند نہ آئی
اپنے بچے بھوک سے پاگل
جب سے آئی ہے مہنگائی

جہاں اُن کے ہاں افکار روایت کے حسین پیرہن میں مکمل کروفر کے ساتھ پائے جاتے ہیں وہاں اُن کے ہاں جدید خیالات کی بھی کمی نہیں ہے اُن کی غزل کے دو جدت آمیز اشعار

زیبِ قرطاس کرتے ہیں:

خامشی بھی مری بغاوت ہے
زیرِ لب کچھ بیان بولتے ہیں
میں تو چپ رہ کے بھی ہنر بانٹوں
میرے اندر جہان بولتے ہیں

اُن کے ہاں حزنیہ جذبات و احساسات بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں اور وہ بھی لطیف انداز میں ہیں وہ اپنی فکر کو کرب انگیز نہیں ہونے دیتے بس غم کی ہلکی سی آنچ محسوس ہوتی ہے مصرعہ سازی کا عمل خوبصورت قرینے سے طے پاتا ہے مصرعوں کے در و بست میں ایک جاذبیت کا پہلو پنہاں ہوتا ہے کہیں کہیں معاملہ بندی بھی ایک حسن پیدا کرنے لگتی ہے اسی حوالے سے اُن کی غزل کا ایک شعر زیرِ مطالعہ لاتے ہیں جہاں روایت اور جدت ساتھ ساتھ ہیں۔

شام ہوتے ہی جلا دیتے ہیں راہوں میں چراغ
مشعلِ مہتاب وہ کب آئے گا ظلمات کے بعد؟

بسمل صابری کے پاس روایت بھی اپنا ایک خاص حسن لیے ہوئے جو اُن کی طربیہ شعری طبع کو چار چاند لگا دیتی ہے اُن کے طربیہ تاثر کے حامل اشعار روح افزا ہیں اُن کی تشبیہات میں بھی ایک کیف و سرور کی فضا ہے اس پر طرہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی شعری صداقتوں سے آگاہ ہیں وہ حقیقت کی دنیا میں سانس لیتی ہیں دنیائے خواب و خیال انھیں مرغوب و مطلوب نہیں ہے۔ اکثر اوقات اُن کا لہجہ رواں دواں ہوتا ہے اُن کے کلام میں سلاست و روانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اسی نسبت سے اُن کی غزل کے دو اشعار قارئینِ شعر و سخن کی نذر کرتے ہیں:

یوں مہکتا ہے مرے دل میں تصور تیرا
باغ میں جیسے کوئی پھول کھلا ہوتا ہے
مجھ کو بسمل نہیں مرغوب خیالی باتیں
میرا ہر شعر میرے دل کی صدا ہوتا ہے

وہ محبتوں کا فروغ چاہتی ہیں انھیں امن و آشتی مطلوب ہے اُن کے خیالات خلوص و

مروت پر مبنی ہیں وہ نامساعد حالات کا شکوہ کرتی ہیں اور ان کے سلجھاؤ کی خواہش مند ہیں ایک رمز اموزگاری کا حامل اُن کی غزل کا ایک شعر دیکھتے ہیں جو اُن کی صلح جو طبیعت کی غمازی کر رہا ہے:

محبتوں کے مسائل سلجھ تو سکتے ہیں
فضا نہیں ہے زمانے کی سازگار ابھی

شعری روایت میں محبوب اپنے تمام اثر طرفہ خیالات کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہے وہ ظلم و زیادتی کرنے کے بعد بھی معصوم ہوتا ہے وہ قتل کرنے کے بعد بھی قاتل متصور نہیں ہوتا۔ اس کی ہر خطا ایک دلکش ادا کا روپ دھار لیتی ہے۔ جفا جو ہونے کے باوجود بھی اُس کی پارسائی کے دعوے بدستور قائم رہتے ہیں اسی حوالے سے اُن کی غزل کا جدید طرز کا حامل مطلع دیکھتے ہیں:

کبھی کھلا نہ بھرم تیری بے وفائی کا
جفا کرے بھی تو دعویٰ ہے پارسائی کا

وہ ادب برائے زندگی کی قائل ہیں وہ حقیقی زندگی کا عمیق ادراک رکھتی ہیں وہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہتی ہیں اور دوسروں کو بھی عزم و حوصلے کا درس دیتی ہیں۔ زیست کی کٹھنائیوں اور اوکھائیوں کی جانکاری دیتی نظر آتی ہیں وہ غمِ زیست سے نالاں نہیں دکھائی دیتیں بلکہ اس کے ادراک پر زور دیتی ہیں اسی حوالے سے اُن کی غزل کا مطلع پیش ہے:

ایک ہی اشک نہ پلکوں پہ سجایا جائے
سب کو مفہومِ غمِ زیست بتایا جائے

راہِ عشق میں انسان تب امر ہوتا ہے جب اُس کے اندر اذیت پسندی کا مادہ پیدا ہوتا ہے اگر انسان کے ہاں ظلم سہنے کا یارا ہو اور دولتِ ضبط ہو تو محبت کی راہوں میں کامیابی انسان کے قدم چومتی ہے وفاؤں کو تو ہر کوئی راحتِ جاں گردانتا ہے اگر کوئی جفاؤں کو راحتِ جاں کہے تو پھر بات ہے جفاؤں پر شاکر و قانع رہنا اور اذیت میں کیف و سرور محسوس کرنا محبت کی معراج ہوتی ہے بقول بسمل صابری:

بارہا اُس کی جفائیں راحتِ جاں ہوگئیں
وادیاں تو خواہشوں کی پھر گلستاں ہوگئیں

یہ اُن کا کمالِ فن ہے کہ جفا کے عالم میں بھی رجا کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ بہار افزا کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ ایک جشنِ طرب کا سماں ہے ایک نشاط و مسرت کی لہر ہے۔

اُن کے ہاں جدید اور روایتی طرزِ فکر پایا جاتا ہے۔ اسلوب انتہائی سادہ و شستہ ہے ایک عام سی بات کو اُن کا طرزِ اظہار ندرت آمیز کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ اسی حوالے سے اُن کا غزل کا ایک شعر دیکھتے ہیں:

پائی ہے کب کسی نے یہاں منزلِ مراد
میری کہانی مفت میں بدنام ہو گئی

الغرض اُن کے ہاں روایت اور جدت کے حسیں شواہد اپنی پوری آب و تاب سے پائے جاتے ہیں اُن کی مقبولیت کا راز ہی اُن کی روایت پسندی اور جدت پسندی میں مضمر ہے اگر عروضی اعتبار سے دیکھا جائے تو اُن کے کلام میں عروضی محاسن بخوبی پائے جاتے ہیں انھوں نے مفرد اور مرکب ہر قسم کی بحور میں لکھا ہے اور زحافات کا استعمال بھی صحیح صورت میں ہوا ہے۔ مشکل و سنگلاخ زمینوں میں بھی سخن گستری کی ہے۔ خالقِ شعر سے دعا ہے کہ اُن کے کلام کو دوامِ دوام سے نوازے۔ (آمین)

* * *

# غزل

بسملؔ صابری، ساہیوال

وہ عکس بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

پیام بر ہے وہی تو مری شبِ غم کا
وہ اک ستارہ جو چشمِ سحر میں رہتا ہے

کھلی فضا کا پیامی ، ہوا کا باسی ہے
کہاں وہ حلقۂ دیوار و در میں رہتا ہے

جو میرے ہونٹوں پہ آئے تو گنگناؤں اسے
وہ شعر بن کے بیاضِ نظر میں رہتا ہے

گزرتا وقت مرا غمگسار کیا ہو گا؟
یہ خود تعاقبِ شام و سحر میں رہتا ہے

مرا ہی روپ ہے تو غور سے اگر دیکھے
بگولہ سا جو تری رہگزر میں رہتا ہے

نہ جانے کون ہے جس کی تلاش میں بسملؔ؟
ہر ایک سانس مرا اب سفر میں رہتا ہے

# غزل

بسملؔ صابری، ساہیوال

جیا پڑا ہے وقت کی رفتار دیکھ کر
بیٹھے کہیں نہ سایۂ اشجار دیکھ کر

تم نے تو غم کو اور بھی سر پر چڑھا دیا
ہم تو ملے فقط تمہیں غمخوار دیکھ کر

شاید یہ گھر ہے دیکھ ذرا اے خیالِ دوست
کیا یاد آ گیا در و دیوار دیکھ کر؟

کیا پھول سی ہنسی پہ گمانِ حیات تھا؟
خنداں ہے وقت مجھ کو سرِ دار دیکھ کر

ہم پھر سے آ گئے اسی کچے مکان میں
اونچے گھروں میں دشت کے آثار دیکھ کر

کتنی کٹھن ہے راہِ وفا تو بھی چل کے دیکھ؟
بسملؔ بھٹک نہ جانا کہیں پیار دیکھ کر

# پروین شاکر احساسِ محبت کے آئینے میں

عمومی مشاہدے کی بات ہے کہ مرد کی نسبت صنفِ نازک میں احساسِ الفت فزوں تر پایا جاتا ہے۔ نسائی احساسات اس امر کی غمازی کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہندی گیتوں میں عورت کی حیثیت عاشق کی سی ہوتی ہے۔ اس سے انکشاف ہوتا ہے کہ بنتِ حوا کا دامن محبت کے جواہر پاروں سے مالا مال ہے۔ اس لیے عمومی رومانوی افکار کو نسائی جذبات سے منسوب کیا جاتا ہے۔ گویا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ عورت چاہت کی پتلی ہے، الفت کی دیوی ہے۔ آج ہمارا موضوعِ سخن پروین شاکر کی محبت سے لبریز شاعری ہے۔ آج ہم ان کے دوسرے شعری مجموعہ ''خوشبو'' کے ربعِ اوّل کے منتخب غزلیہ اشعار زیرِ تجزیہ لاتے ہیں۔

ان کے خیالات نادر النظیر ہیں۔ اسلوب جاذبیت سے لبریز ہے۔ عمومی احساسات بھی اپنے اندر اپنائیت کا پہلو خود میں سموئے ہوئے ہیں۔ ان کے افکار قارئین کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں اور وہ ایک دل دوز کیفیت سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اسی حوالے سے ان کی غزل کے چار اشعار لائقِ التفات ہیں ؎

تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن مور بن کر ناچتا ہے
مجھے ہر کیفیت میں کیوں نہ سمجھے
وہ میرے سب حوالے جانتا ہے
میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

کسی کے دھیان میں ڈوبا ہوا دل
بہانے سے مجھے بھی ٹالتا ہے

بعض اوقات ان کے ہاں بیزاری بھی خوشگواری کا روپ دھار لیتی ہے۔ وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن جانتی ہیں۔ اس لیے ان کے کلام میں اختصار و جامعیت ہے جو انہیں دیگر ہم عصر شاعرات سے ممتاز و منفرد کرتی ہے۔ اکثر اوقات ان کے ہاں نسائی خیالات بھی غیر روایتی انداز میں ملتے ہیں۔ ان کی غزل کے دو اشعار دیکھتے ہیں ؎

آج ملبوس میں ہے کیسی تھکن کی خوشبو
رات بھر جاگی ہوئی دلہن کی خوشبو
پیرہن میرا مگر اس کے بدن کی خوشبو
اس کی ترتیب ہے ایک ایک شکن کی خوشبو

ان کے افکار محبت سے لبریز ہیں جن میں پھولوں کی خوشبو بھی ہے، زخموں کا کرب بھی، ہجر و وصال کے فسانے بھی ہیں کہیں روٹھنے کا مذکور ہے تو کہیں منانے کا ماجرا۔ ان کا عشق جنوں کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ قارئین کے ذوقِ طبع کی نذر ان کی غزل کے پانچ اشعار ہیں ؎

قریۂ جاں میں کوئی پھول کھلانے آئے
وہ مرے دل پہ نیا زخم لگانے آئے
میرے ویران دریچوں میں بھی خوشبو جاگے
وہ مرے گھر کے در و بام سجانے آئے
اس سے اک بار تو روٹھوں میں اسی کی مانند
اور وہ میری طرح مجھ کو منانے آئے
اسی کوچے میں کئی اس کے شناسا بھی تو ہیں
وہ کسی اور کے ملنے کے بہانے آئے
اب نہ پوچھوں گی میں کھوئے ہوئے خوابوں کا پتا
وہ اگر آئے تو کچھ بھی نہ بتانے آئے

محبت یا رومان ان کے کلام کا مستقل حوالہ ہے۔ جا بجا وہ چاہتوں کے پھول بکھیرتی نظر آتی ہیں، گویا وہ سراپا رومان ہیں۔ ان کی ایک غزل بدونِ تبصرہ دنیائے سخن کے متوالوں کے لیے زیبِ قرطاس ہے۔

چہرہ میرا تھا نگاہیں اس کی
خامشی میں بھی وہ باتیں اس کی
میرے چہرے پہ غزل لکھتی گئیں
شعر کہتی ہوئی آنکھیں اس کی
شوخ لمحوں کا پتا دینے لگیں
تیز ہوتی ہوئی سانسیں اس کی
ایسے موسم بھی گزارے ہم نے
صبحیں جب اپنی تھیں شامیں اس کی
دھیان میں اس کے یہ عالم تھا کبھی
آنکھ مہتاب کی یادیں اس کی
رنگ جوئیندہ وہ آئے تو سہی
پھول تو پھول ہیں شاخیں اس کی
فیصلہ موجِ ہوا نے لکھا
آندھیاں میری بہاریں اس کی
خود پہ کھلتی نہ ہو جس کی نظر
جانتا کون زبانیں اس کی؟
نیند اس سوچ سے ٹوٹی اکثر
کس طرح کٹتی ہیں راتیں اس کی
دور رہ کر بھی سدا رہتی ہیں
مجھ کو تھامے ہوئے بانہیں اس کی

ان کا اسلوب انتہائی شستہ اور رواں دواں ہے، ان کے ہاں ایک خود کلامی کا سا انداز ہے، معاملہ بندی ہے، مکالمہ نگاری ہے۔ الغرض تمام شعری خصائص موجود ہیں جو ایک صحت مند شعری روایت کا حصہ ہیں، جذبوں میں شدت وحدت ہے، حزن والم اپنی انتہا کو چھوتا نظر آتا ہے، ان کے ہاں تنقیدی رویے وفور سے پائے جاتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ایک کرب وسوز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں حقیقی زندگی کے خدشات بھی اپنے کروفر سے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں وسیع و عمیق مشاہدات کا فروغ بھی ہے، ان کی ایک پوری غزل لائق توجہ ہے ؎

عکس خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی
کانپ اُٹھتی ہوں میں سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی
جس طرح خواب مرے ہو گئے ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی
میں تو اس دن سے ہراساں ہوں کہ جب حکم ملے
خشک پھولوں کو کتابوں میں نہ رکھے کوئی
اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں
اب کسی اُمید سے دروازے سے نہ جھانکے کوئی
کوئی آہٹ، کوئی آواز، کوئی چاپ نہیں
آس کی گلیاں بڑی سنسان ہیں آئے کوئی

ان کے ہاں حسرتوں کا دکھ بھی ہے، ادھورے سپنے بھی ہیں، آس اور امید کے بھی کئی پہلو ملتے ہیں۔ ان کے ہاں رجائیت بھی پورے طور پر پرتو فگن ہے، کہیں کہیں ان کے ہاں دعائیہ انداز بھی ملتا ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع ہے، طرح طرح کے خیالات قاری کے لیے آغوش کشا نظر آتے ہیں۔ ان کے اشعار دل کے تاروں کو چھونے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی ان کی مقبولیت اور پذیرائی کا سبب ہے۔ ایک اور غزل کے دو اشعار قابل غور ہیں ؎

کوئی تو ہو جو مرے تن کو روشنی بھیجے
کسی کا پیار ہوا میرے نام لائی ہو
کبھی تو ہو مرے کمرے میں ایسا منظر بھی
بہار دیکھ کے کھڑکی سے مسکرائی ہو

وہ انسانی نفسیات کا عمیق ادارک رکھتی ہیں۔ وہ اپنے محبوب کے حوالے سے تمام تر جزئیات کو شعری پیرہن عطا کرتی ہیں۔ ان کی غزل رومان سے شروع ہوتی ہے اور رومان پہ ختم ہوتی ہے جس کا ابتدائیہ، وسطانیہ اور اختتامیہ سب رومان ہی ہے۔ نسائی احساسات کی کسک بھی ہے جو اپنے مخصوص رنگ و آہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کی شاعری جوان جذبوں کی شاعری ہے، اس لیے وہ نوجوان طبقے میں بے حد مقبول ہیں۔ ہر موسم اور ہر رُت میں ان کے افکار سدا بہار نوعیت کے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری ہر عہد کی شاعری ہے۔ ان کی ایک جذبۂ محبت سے لبریز غزل ملاحظہ ہو ؎

بعد مدت سے اسے دیکھا لوگو!
وہ ذرا بھی نہیں بدلا لوگو!
خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی
اس کے چہرے پہ لکھا تھا لوگو!
اس کی آنکھیں بھی کہے دیتی تھیں
رات بھر وہ بھی نہ سویا لوگو!
اجنبی بن کے جو گزرا ہے ابھی
تھا کسی وقت میں اپنا لوگو!
دوست تو خیر کوئی کس کا ہے؟
اس نے دشمن بھی نہ سمجھا لوگو!
رات وہ درد مرے دل میں اٹھا
صبح تک چین نہ آیا لوگو!

پیاس صحراؤں کی پھر تیز ہوئی
ابر پھر ٹوٹ کے برسا لوگو!

ان کے ہاں محبت کے جذبے نرالے اور اچھوتے انداز میں ملتے ہیں۔ سوز و گداز بھی ہے تنہائی اور رسوائی بھی ہے۔ جاں سپاری بھی ہے اور فرماں برداری بھی۔ ان کی غزل کے پانچ اشعار دیدنی ہیں ۔

ایک اک کر کے مجھے چھوڑ گئیں سب سکھیاں
آج میں خود کو تری یاد میں تنہا دیکھوں
تو مرا کچھ نہیں لگتا مگر جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں
سب ضدیں اس کی میں پوری کروں ہر بات سنوں
ایک بچے کی طرح سے اسے ہنستا دیکھوں
مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی روپ میں مہکتا دیکھوں
تو میری طرح سے یکتا ہے مگر میرے حبیب
جی میں آتا ہے کوئی اور بھی تجھ سا دیکھوں

پروین شاکر کے کلام کے بنظرِ غائر مطالعے سے اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ وہ رومان نگاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ ان کے جذبات و احساسات نسائیت آمیز بھی ہیں جن سے ایک اپنائیت کا احساس چھلکتا ہے۔ پروین شاکر ایک ایسی شاعرہ ہیں جنہیں ہر عہد میں پڑھا اور سراہا جائے گا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پروین شاکر کے محبت آمیز، لطیف نسوائی جذبات کے تعمق کے ساتھ ساتھ قدرتِ کلام اور حسنِ بیان بھی پورے طور پہ بہار آفریں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خوبصورت الفاظ ہاتھ باندھے ہوئے ان کی قرینہ کاری کے منتظر ہیں۔

* * *

# غزل

### پروین شاکر

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے؟
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو مرے پاس آیا؟
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

تیرا پہلو، تیرے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شب تنہائی کی

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اُٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

# غزل

### پروین شاکر

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دلہن سجاؤں گی

سپرد کر کے اسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ آؤں گی

بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا
میں دل میں روؤں گی، آنکھوں میں مسکراؤں گی

وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے؟
میں کس سے روٹھ سکوں گی کے مناؤں گی؟

اب اس کا فن تو کسی اور سے ہوا منسوب
میں کس کی نظم اکیلے میں گنگناؤں گی؟

بچھا دیا تھا گلابوں کے ساتھ اپنا وجود
وہ سو کے اُٹھے تو خوابوں کی راکھ اُٹھاؤں گی

جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبت کا
وہ کہہ رہا تھا کہ میں اُس کو بھول جاؤں گی

# ذکیہ غزل کی خلوص پرور غزل

دراصل شاعری ان پوتر اور معصوم جذبوں سے عبارت ہے جس کی بنیاد خلوص و مروت، مہر و وفا، لطف و کرم، امن و آشتی اور صدق و صفا پر استوار کی گئی ہے یہی امر غزل کی حسین روایت کا حصہ ہے غزل کے اندر تغزل کی چاشنی اور مہک پیدا کرنے کے لیے اس کے کلاسیکی تلازمات کا التزام انتہائی ناگزیر ہے اگرچہ ابتدائی ادوار کی غزل کو ہمیشہ تنگ دامنی کی شکایت رہی ہے لیکن شعری تاریخ کا وہ محبوب ترین عہد شمار کیا جاتا ہے عصرِ حاضر میں غزل حیات و کائنات کے تمام تر موضوعات کا احاطہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے لیکن اسے وہ خلوص پرور فضا میسر نہیں آسکی جو قدما کے ہاں موجود ہے عصرِ حاضر میں غزل میں نکھار لانے کی مقتضیات یہ ہیں کہ کلاسیکیت اور جدیدیت کے حسین امتزاج کو فروغ میسر ہو تو پھر غزل اپنی تمام تر صنفی و فکری نفاستوں، لطافتوں اور نزاکتوں کی بدولت زندہ جاوید رہے گی یہ تمام تر التزامات ذکیہ غزل کی غزل کے بغور مطالعہ کے دوران مشاہدہ و تجزیہ میں آئے ہیں شاعرہ مذکور کا تعلق کراچی سے ہے اور کافی عرصہ سے اعتماد کی فضا میں شعر کہہ رہی ہیں ان کا اولین شعری مجموعہ ”بادل گیت ہوا اور میں“ مطبوعہ 2001ء ہمارے پیشِ نظر ہے جس میں غزلیات و آزاد نظمیات اور نظم منثور شامل ہیں ان کی تخلیقی اپج کو سمجھنے کے لیے ان کی غزل کا مطالعہ انتہائی ناگزیر ہے ان کے مذکورہ مجموعے کے ثلث اول کی غزلیات کے منتخب اشعار شاملِ تجزیات ہیں۔

ان کی ایک غزل کے دو اشعار لائقِ توجہ ہیں ؎

محبتوں کے سفر میں جدائی حاصل ہے
یہ راہِ عشق ہے اس میں گدائی حاصل ہے

تمہاری سمت ہی جاتے ہیں راستے سارے
تمہاری قید سے کس کو رہائی حاصل ہے؟

یہ ایک عمومی اور سطحی زاویۂ فکر ہے جسے روایت کی حیثیت حاصل ہے کہ دشت عشق و محبت کی مسافت بے سود ہوتی ہے جبکہ لاحاصلی بھی ایک حاصل ہوتا ہے جدائی، غم و سوز، گرد مسافت، رسوائی، تا دیر رہنے والی تکان بھی الفت کے شوخ اور گہرے حاصلات ہیں بے نیازی سے کاسۂ گدائی تک کا سفر کیسے لاحاصل ہو سکتا ہے یہی معاملات غزل ذکیہ غزل کے غزلیہ کینوس میں بھی پائے جاتے ہیں ان کے کلام میں ایمائیت کا رنگ ایسا ہے جسے معرفت و مجاز پہ آسانی مہمیز کیا جا سکتا ہے ان کے ہاں رجائی امکانات کی کرنیں بھی جلوہ ریز ہوتی محسوس ہوتی ہیں ؎

شب کی تیرگی کا غم اس طرح بھلاتا ہے
ہر منڈیر پہ گھر کی اک دیا جلاتا ہے
شہر کی فصیلوں پہ کیوں پیام لکھتے ہو؟
تم کو زورِ بازو سے انقلاب لانا ہے

ان کے ذہنی کینوس میں رجائیت آمیز تخیلات کی چکاچوند پورے طور پہ ملاحظہ کی جا سکتی ہے جو ان کے عزم و حوصلے کی بین دلیل ہے امید کی پیوندکاری کی طرف واضح اشارہ ہے وہ انقلاب کی حامی اور پیامی ہیں جو ان کے خلوص پہ وجذبات کے جواز کی غمازی ہے وہ ایسے ضبط کی قائل نہیں جسے کسی نوع کی کمزوری اور مجبوری کا مثیل کہا جائے ؎

مصلحت کی زنجیریں توڑ کر ذرا دیکھو
ایک چپ کے پردے میں عمر کیا بتانی ہے؟

ان کی اظہاری جسارتیں تندرست و توانا حوالوں کی حامل ہیں وہ کتھارس کے افادی پہلوؤں اور فوقیت کو مسلمہ سمجھتی ہیں بقول نذیر قیصرانی ؎

ان جبر کے سجدوں میں کہیں ٹوٹ نہ جاؤں
پتھر کے خداؤ میری شیشے کی جبیں ہے

غزل کا فکری خلوص جراتوں کا عمیق حوالہ ہے یہی آموزش ان کے ہاں عندالبیان پائی

جاتی ہے ۔

جب کسی درد کا درماں نہ ہو ممکن
حاکمِ وقت کی دستار گرادی جائے

وہ زیست کی مظلومیت امیز صورتِ حال کو تسلیم نہیں کرتیں کیونکہ وہ جرأتِ بیاں کا یارا رکھتی ہیں ان کی اظہاری جسارتوں کے سامنے سماج کی کسی کج روی کو ٹھہرنے کی پل بھر بھی اجازت نہیں جوان کی بے باکیٔ سخن کی طرفہ تمثیل ہے وہ حیات کی کٹھنائیوں کو ادراکات کی تربیت کا التزام گردانتی ہیں اس لیے ان کے پایۂ استقلال میں لغزش نہیں آتی ۔

مشکلوں سے اور مستحکم ہوا
کوئی لغزش اب نہیں ایمان میں

وہ گردشِ ایام کو ایک ایسی بھٹی قرار دیتی ہیں جس میں جل جل کر انسان کندن بن جاتا ہے جس سے اس کے ادراکاتی زاویوں میں وسعت اور تنوع پیدا ہوتا ہے اس لیے ان کا ایمان مضبوط و معتبر ہے ۔

کوئی سچ نہیں سنتا کوئی سچ نہیں سنتا
بے حسی جو بڑھ جائے چیخنا ضروری ہے

الفاظ و کلمات کا تکراری پہلو جہاں شدتِ فکر کا غماز ہے وہاں زورِ بیاں کا اعجاز ہے جب معاملہ صداقت نگاری اور حقیقت پسندی کا ہو تو ان کا لہجہ بلند بانگ ہو جاتا ہے جس سے جوشِ خطابت بھی چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ عصرِ حاضر کے انسان میں زندگی کے حقیقی مظاہر کی متلاشی نظر آتی ہیں ۔

چلتے پھرتے جسموں میں بھی
روحوں کے فقدان بہت ہیں

وہ زیست کی اساسی اقدار کو ترجیح دیتی ہیں انھیں حیات ایک مثالی روپ میں تمام تر رونقوں اور رعنائیوں کی حاشیہ آرائی کے ساتھ مطلوب ہے جب انھیں یہ شواہد معدوم نظر آتے ہیں تو وہ مجبوریاں ہو جاتی ہیں ان کی شکوہ سنجی اظہاری صورت اختیار کر لیتی ہے بقول ابوالاثر حفیظ

جالندھری ؎

چلتے پھرتے ہوئے مردوں سے ملاقاتیں ہیں
زندگی کشف و کرامات نظر آتی ہے

وہ افسردگی کے عالم میں رہینِ یاس نہیں رہتیں بلکہ رجا کے نغمے تواتر سے الاپتی رہتی ہیں جن میں امید کی کرن ہوتی ہے جو قاری کے قلب و خرد کو معطر و معنبر کرتی چلی جاتی ہے جس کا سفر لامتناہی ہوتا ہے ؎

من کی سوکھی دھرتی پر بھی
بارش کے امکان بہت ہیں

انہیں زیست کی برہمی کی صورت مایوسی اور سراسیمگی سے ہمکنار نہیں کرتی بلکہ ولولۂ تحرک سے نوازتی ہے جس کے باعث جذبوں میں رچاؤ اور مہک کی ایک صورت پیدا ہو جاتی ہے ؎

چلتے چلتے کہاں کھو گئی زندگی؟
جاگتے جاگتے سو گئی زندگی

ذکیہ غزل کی غزل میں خلوص کی وہ پاسداری اور عملداری ہے جو بہت کم شعرا اور شاعرات کے ہاں آشکار ہوتی ہے مگر ان کی فکر کو مزید بالیدگی مطلوب ہے تا کہ ان کے فکری زاویے مزید رفعت آمیز رنگ اختیار کر سکیں۔ فنی حوالے سے عمیق ریاضت درکار ہے کیوں کہ اگر ان کا فنی وجدان اتنا مستحکم ہوتا تو نظمِ منثور جیسی خارج از فن صنف قرینِ قیاس نہ ہوتی بہرحال انہیں فن کی طرف مخلصانہ مراجعت کی ضرورت ہے جس کے سبب ازمنۂ فردا میں روشن امکانات کی نوید دی جا سکتی ہے۔

◆

# غزل

ذکیہ غزل، کراچی

ہماری آنکھوں میں خواب اترے تو شعر لکھے
ترے لبوں کے جواب اترے تو شعر لکھے

بہت دنوں سے اداس تھے ہم نہیں لکھا تھا
خیال میں جب جناب اترے تو شعر لکھے

تمام موسم گزر گئے تھے کلی کو چھو کر
جب اس پہ رنگِ شباب اترے تو شعر لکھے

وہ فصلِ غم تھی کہ آنکھ نم تھی خوشی بھی کم تھی
جو بنتے، مٹتے حباب اترے تو شعر لکھے

گئی رتوں کے عذاب جھیلے جدائی جھیلی
نئی رتوں کے ثواب اترے تو شعر لکھے

وہ سبز موسم کبھی تو آئے دعا یہ مانگی
ہمارے آنگن گلاب اترے تو شعر لکھے

# غزل

ذکیہ غزلؔ، کراچی

میں تری یاد کے صحرا سے گزر آئی ہوں
ہجر کی دھوپ کو آنگن میں اٹھا لائی ہوں

وہی مانوس سی خوشبو مرے اطراف رہی
وہی پیکر تو خیالوں میں بسا لائی ہوں

مری نظروں میں کہاں جاہ و حشم کی قیمت؟
میں تو ہر بار ترے درد کی سودائی ہوں

بھول جانے کا کوئی گر تو مجھے بھی آتا
جب تجھے یاد کیا اور بھی پچھتائی ہوں

میری خواہش تھی یہاں پیار کی خوشبو پھیلے
لیکن اب شہرِ منافق سے نکل آئی ہوں

میں ترے در کی گدا ہوں ہے طلب میری وفا
خالی کشکول لیے در پہ ترے آئی ہوں

# رخشندہ نوید محبت کے موسموں کی شاعرہ

محبت ایک اقلیم الفت ہے جس کے کئی رنگ ہیں اور ہر رنگ قوس قزح کے رنگوں کی طرح حسین اور دلکش ہے محبت مختلف کیفیات وواردات سے مملو ہوتی ہے جنہیں اس کے موسموں سے عبارت کیا جاتا ہے ان موسموں میں ہجر ووصال، مسرت وعسرت، حیرت واستعجاب اور سوز وگداز وغیرہ شامل ہیں محبت کے موضوع میں اتنی وسعت ہے کہ دنیا ومافیا کے تمام تر موضوعات اس میں سما سکتے ہیں اور یہ تمام تر موضوعات کا سرنامہ ہے باقی جذبات واحساسات ذیلی اور معاون نوعیت کے ہیں ان افکار سے مرصع شاعری ہر عہد میں اعتبار ذوق رہی ہے اور رہے گی یہ تخیلات ہر عہد میں افتخار زریں قرار پاتے ہیں اور ان کی اہمیت مسلمہ ومصدقہ سمجھی جاتی ہے ایسی شاعری ہر رت میں سدا بہار اور تر وتازہ رہتی ہے اگرچہ جدید شعری رویوں میں محبت سے انحراف اور اختلاف کا رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے لیکن اس کی اہمیت کم ہونے کی بجائے مزید نکھر کر سامنے آتی ہے جس سے یہ استخراجی نتیجہ سامنے آیا ہے کہ جواں جذبوں کی اہمیت سے انکار اور فرار ممکن نہیں ہے اکثر وبیشتر شاعرات کا کلام محبت کے حسین احساسات سے مزین ہوتا ہے جس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ نسائی شاعری میں داخلی اظہار بھرپور انداز میں پایا جاتا ہے محبت چوں کہ داخلی کیفیت کا نام ہے کیوں کہ محبت کی نمو انسان کے دروں سے ہوتی ہے اس لیے شاعرات کے ہاں رومان نگاری کے وسیع تر امکانات پائے جاتے ہیں شذرہ ھذا میں رخشندہ نوید کی شاعری کے حوالے سے رقم طراز ہیں جو تمام تر محبت کے موسموں سے مسجع ہے ان کے تیسرے شعری مجموعے ”تلیاں اتریں پار“ مطبوعہ 2009ء کے منتخب غزلیات کے اشعار مذکورہ موضوع کے تناظر میں شامل شذرہ کرتے

ہیں مذکورہ مجموعہ کا نام جہاں محبت سے لبریز ہے وہاں دور اندیشی کا غماز بھی ہے رخشندہ نوید کا بنیادی تعلق لاہور سے ہے پنجاب یونیورسٹی سے انہوں نے صحافت میں ایم اے کیا تعلیم و تعلم کے شعبہ سے منسلک ہیں تدریسی امور کا عمیق تجربہ رکھتی ہیں واضح رہے قبل ازیں انکے دو شعری مجموعے ''پھر وصال کیسے ہو'' مطبوعہ 2004ء اور ''کسی اور سے محبت'' مطبوعہ 2007ء قارئین شعر و سخن سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

رخشندہ نوید کے کلام سے فکری بلوغت کے آثار ضو پاشیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں اس لیے ان کے افکار نادرالنظیر اور رفعتِ تخیل کے حامل ہیں ان کی قوتِ متخیلہ جدت و ندرت کی دولت سے مالا مال ہے ان کے تخیلات میں صنعتِ تضاد اور متضاد خیالات کا اہتمام خوبصورت قرینے سے ملتا ہے جس سے بیان کی دلکشی دوبالا ہوجاتی ہے ان کی فکر ہمہ جہت اور ہمہ پہلو ہے اس لیے اس بیک وقت معرفت و مجاز دونوں پر مہمیز کیا جا سکتا ہے محبت کے حوالے سے ان کے شعری مخزن میں ایک طرح کی جزئیات نگاری پائی جاتی ہے جہاں محبوب کے لطف و کرم کا تذکرہ ہے وہاں جور و جفا کا مذکور بھی ہے اسی نسبت سے ان کی غزل کا مطلع اور ایک شعر لائق التفات ہے ؎

اسی لیے تو سمجھ رہی ہوں اسے خدا بھی
قریب رہتا بھی ہے مرے مجھ سے جدا بھی
مرے مسیحا کی وجہ شہرت ستمگری ہے
وہ زخم کے ساتھ ساتھ دیتا رہا دوا بھی

ان کے ہاں محبت کے حوالے سے عمیق احساسات پائے جاتے ہیں جن میں ایک بے خودی ہے عالمِ جنوں ہے چاہت کا فسوں ہے کیف و سرور ہے جوش و جذبہ ہے سرخوشی اور سرمستی کی ایک فضا پائی جاتی ہے جس کے باعث ان کا طرزِ اظہار فطری نوعیت اختیار کر جاتا ہے جو بناوٹ، تصنع اور آورد کی آلائشوں سے مبرا و ماورا ہے بلکہ خالصتاً آمد کا انداز ہے جن میں محبت کی کیفیات کو سمو دیا گیا ہے ؎

کیسے نکلوں خمار سے باہر؟

بازوؤں کے حصار سے باہر
چند لمحوں کی مختصر قربت
اور یادیں شمار سے باہر
اس لیے اس کی یاد میں گم ہوں
بھولنا اختیار سے باہر

روایت کی حسین پاسداری بھی ان کے کلام کا ایک وصفِ خاص ہے اسلوبیاتی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ان کا اسلوب سہلِ ممتنع کی ردا اوڑھے قاری کے لیے آغوش کشا نظر آتا ہے ۔

اک اک کر کے لوٹا دے گا میرا سب کچھ دیا ہوا
آپ بہت اچھی ہیں کہہ کر پہلا قرض اتارا ہے
عشق میں قتل روا ہوتا ہے لیکن میرے ستمگر نے
پانی جہاں نہیں تھا مجھ کو لا کر وہیں پہ مارا ہے

محبت کا بسیط احساس چاہت کے موسموں کی شدت و حدت کی غمازی کرتا ہے جس سے ساگر کی امواج میں تموج کی عکاسی ہوتی ہے شعر کے مختصر پیمانے میں وہ اپنے موضوع کو دفعتاً سمیٹنے کا فن جانتی ہیں جس سے شعر میں کلائمکس اور تجسس پیدا ہوتا ہے ان کی یہی شعری پر اسراریت قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے اسی حوالے سے ان کی ایک اور غزل کا مطلع درِ التفات پہ دق الباب کر رہا ہے ۔

شاخِ تن آپ کے شانوں میں حمائل ہوگی
ایک لمحے کو ہوا تک بھی نہ حائل ہوگی

دشتِ الفت میں جہاں بیابانِ تنہائی ہے عالمِ ہجراں عالمِ شباب پہ ہے جہاں وصل کا کوئی گماں تک نہیں محبوب کے رستے میں نینوں کے پھول بچھائے جب کوئی امید بر نہیں آتی تو پھر محب کو شدید نوعیت کی تکان کا احساس ہوتا ہے اسی فکر کی ترجمانی رخشندہ نوید کی زبانی دیکھتے ہیں ۔

تمہاری راہ برسوں تک چکی ہوں
ان آنکھوں کی قسم اب تھک چکی ہوں

ان کے محبتوں کے موسموں معتدل نہیں ہیں بلکہ تغیر پذیر ہیں جہاں لمحہ بہ لمحہ انقلابات بپا ہوتے رہتے ہیں جن کے باعث افکار کی شدت وحدت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے مذکورہ استشہادات کے علاوہ بھی بے شمار شعری تصریحات ہیں جو محبت کی مختلف کیفیات کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں اسی تناظر میں کچھ شعری مثال بدون تبصرہ شعروسخن کے متوالوں کے ذوقِ طبع کی نذر ہیں ؎

مجھ میں کچھ اور میرے سوا بھی تو ہے
معبدِ عشق میں اک خدا بھی تو ہے
انتظار ، انتظار ، انتظار آپ کا
ظلم ہے ظلم کی انتہا بھی تو ہے

☆

ایک یہ دل ہے کہ ترتیب میں آتا ہی نہیں
ایک اظہارِ محبت ہے جو بے ڈھنگ سا ہے

☆

تری یادوں کا دل میں اک خزانہ بن گیا
یہ ہم پیاسوں کی خاطر آب و دانہ بن گیا

☆

یہ خوئے بے نیازی وہ عمل پیرا ہے جس پہ
یہ جاں لیوا تو ہے لیکن پسندیدہ ہے میری

☆

تو سامنے بیٹھا ہو ترا ساتھ بہت ہے
میرے لیے تو اتنی ملاقات بہت ہے

☆

تجھ سے ملنے کی جب مجھ کو جلدی لگی
پھر نہ گرمی لگی اور نہ سردی لگی

مذکورہ استخراجات اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ رخشندہ نوید کا کلام محبت کی عمیق کیفیات کا ترجمان ہے ایک اتھاہ سمندر ہے جس میں غواصی کے بعد قاری کے وجود کا خشک رہنا محال ہے قاری اس سرشاری سے ہم آغوش ہو جاتا ہے جو بین السطور شعریت کی کومل لے کی صورت رقصاں نظر آتی ہے اور رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے بہرحال اگر ان کی شعری عرق ریزی تسلسل سے جادۂ منزل پہ محوِ سفر رہی تو ان کے موضوعاتی کینوس میں بھی مزید وسعت کے شواہد اشکار ہوں گے۔

◆

# غزل

رخشندہ نوید، لاہور

ستم گروں سے عداوتیں کیا؟
انہی سے ان کی شکایتیں کیا؟

سفر کی دیکھیں تمازتیں کیا؟
نکل پڑیں تو نزاکتیں کیا؟

دلوں میں پچھلی کدورتیں ہیں
لبوں پہ ان کے حلاوتیں کیا؟

غمِ جہاں کو سمیٹ کے رکھ
سخن میں ہوں گی ریاضتیں کیا؟

جب عقل پہ پڑا ہے پردہ
بصیرتیں کیا، سماعتیں کیا؟

رموز جیون کے کھل نہ پائے
یہ روز و شب ہیں بجھارتیں کیا؟

# غزل

رخشندہ نوید، لاہور

سلسلوں کی ابتدا کو انتہا کرنا پڑا
چاہتوں میں ایک بت کو بھی خدا کرنا پڑا

بے رخی حد سے بڑھی لیکن یقیں آتا نہ تھا
دل کو سمجھانے کی خاطر حوصلہ کرنا پڑا

چند گھڑیاں باعث مرگ محبت ہو گئیں
آخری ہچکی کو بھی حرف دعا کرنا پڑا

کیا سلیقے ڈھونڈتی اس سے بچھڑنے کی گھڑی؟
مجھ کو اپنے ہاتھ سے ناخن جدا کرنا پڑا

میرے جذبوں کی اُڑانیں دیکھ کر وہ ڈر گیا
تنگ آ کر صید کو اک دن رہا کرنا پڑا

# رضیہ فاروقی کا رنگِ تسلیم و رضا

صبر و تحمل ۔ توکل و استغنا اور تسلیم و رضا بنی نوعِ انسان کے وہ اوصاف حمیدہ ہیں جو مشیت ہر کسی کو ودیعت نہیں کرتی بلکہ صرف اپنی محبوب شخصیات کو عنایت کرتی ہے اور انھیں مقامِ اعتبار سے نوازتی ہے جنھیں یہ خصائص عطا ہو گئے وہ قلندرانہ صفات سے متصف ہو گیا آج کے مادی و دنیاوی دور میں یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جو حقیقت پسندی اور مصلحت کیشی کی دلیل ہے قدرت کا بے پایاں احسان ہے اور کسی معجزے سے کم نہیں ایسی بالیدہ فکر اور فرخندہ نصیب شخصیات میں ایک نام رضیہ فاروقی کا بھی ہے جن کا سخن مذکورہ خصوصیات کا حامل ہے اس وقت ان کا اولین شعری مجموعہ ”اک محفل تنہائی“ مطبوعہ 2005ء ہمارے زیر نظر ہے جس میں پابند و آزاد نظمیات، غزلیات اور ہائیکو شامل ہیں انھوں نے مذکورہ اصناف سخن جن میں حمد و نعت اور منقبت بھی شامل ہیں کو خالصتا ان کے صنفی مزاج کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے برتا ہے اور یہی ان کا کمالِ فن ہے ان کے اس مجموعہ کی غزلیات کے منتخب اشعار برائے تجزیات و استخراجات شامل شدہ ہیں ان کا بنیادی تعلق کراچی سے ہے اور کافی عرصہ سے اعتماد کی فضا میں شعر کہہ رہی ہیں۔

رضیہ فاروقی کے فحوائے بیاں میں سادگی و پرکاری، خلوص و مروت کی پاسداری، مصلحت پسندی اور سنجیدگی کی خصوصیات ملتی ہیں وہ ایک مفاہمت پسند طبع کی حامل ہیں وہ نفرت اور حسد و

کینہ جیسے اخلاقِ رذیلہ سے مبرا و ماورا ہیں اُن کی فکر خالص فطری نوعیت کی حامل ہے جس میں کسی نوع کے تصنع کا کوئی گماں نہیں گزرتا۔

سوچا تھا بات سن کے تری چپ رہیں گے ہم
مجبور دل سے ایسے ہوئے مسکرا دیے
آئے ہیں وہ بھی پرسشِ احوال کے لیے
شکوے ہمارے دل میں تھے جتنے مٹا دیے

اُن کا اخلاص مثالی نوعیت کا ہے اُن کی جاں سپاری پروانے کی مثیل اور اُن کی بے پناہ محبت کی دلیل ہے جسے وہ معیار گردانتی ہیں۔

دینی ہو جاں تو جذبہ پروانہ کیجیے
ہم جیسا ہی کوئی دیوانہ چاہیے

رضیہ فاروقی کے رنگِ تسلیم و رضا کا کمال بے مثال دیکھیے کہ اُن کے ادراکاتی کینوس میں نالہ و شیون کا کوئی گزر نہیں ہے بلکہ اُن کے فکری منظر نامے پر صبر و تحمل اور قناعت پسندی جیسی قلندرانہ صفات نمایاں ہیں۔

نہ پوچھا اُس نے حالِ دل نہ کچھ ہم نے شکایت کی
رہا دل میں حسابِ دوستاں یوں زندگی گزری

رضیہ کی فکری کا عارفانہ عالم یہ ہے کہ حزن و الم سے موانست کا پہلو ملتا ہے اُن کے نزدیک غم و سوز کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔

کروں میں کس زباں سے اُس کا شکوہ؟
مجھے جو دولتِ غم دے گیا ہے

اُن کے کلام میں قناعت پسندی کے وسیع امکانات پنہاں ہیں اس لیے مصائب و آلام اور ظلم و ستم کے باوجود بھی وہ ہر نوع کے جوابی و انتقامی رویوں سے گریزاں نظر آتی ہیں یہ امر اُن کی بالیدہ فکری اور خوئے قلندرانہ کا غماز ہے وہ حرص و ہوس، لوبھ اور لالچ جیسے عمرانی امراض سے ماورا

ہیں اور اہلِ دنیا کی دنیاوی روش سے گریزاں ہیں۔

افسانہ طرازی میں ماہر یہ زمانہ ہے
دنیا کا یہی ہم پہ انعام ہی رہنے دو
شہرت کی تمنا میں مل جائے نہ بدنامی
ہم خاک نشینوں کو گمنام ہی رہنے دو

رضیہ فاروقی کا کلام عمومی نسائی شعری ڈگر سے ہٹ کر ہے ان کا اسلوب مکمل طور پر ان کے موضوع کے تابع رہتا ہے اگر ان کی ریاضِ شعر کے حوالے سے یوں ہی عرق ریزی روبہ تسلسل رہی تو ان کے کلام میں فزوں تر نکھار آشکار ہوگا۔

* * *

# غزل

رضیہ فاروقی، کراچی

کوئی اخلاص و محبت کا طلبگار نہیں
کس سے اب جا کے ملیں کوئی بھی غم خوار نہیں؟

میری آزاد طبیعت کا ہے صحرا مسکن
اب مری راہ میں حائل کوئی دیوار نہیں

اتنی پیچیدہ ہوئی رہگزر زیست کہ اب
کس طرف جائیں کوئی راستہ ہموار نہیں

مسئلہ یہ ہے کہ اب علم و عمل میں ہے تضاد

یہ جو یکجا ہوں کوئی کام بھی دشوار نہیں

عقلِ خوابیدہ کا رضیہ یہ نتیجہ نکلا
سب کی آنکھیں ہیں کھلی کوئی بھی بیدار نہیں

# غزل

رضیہ فاروقی، کراچی

جس طرح سے برتو اسی سانچے میں ڈھلی ہے
بنیادِ محبت کی بُری ہے نہ بھلی ہے

ڈھونڈیں گے بس اس طرح سے ہم اپنا ٹھکانہ
مل جائے سکوں دل کو جہاں اپنی گلی ہے

اک دیس کو چھوڑ آئے ہیں اک دیس کی خاطر
تاریخ میں مرقوم یہ باخطِ جلی ہے

ہو جذبۂ صادق تو فنا میں بھی بقا ہے

ہر دور میں یہ رسم بہرطور چلی ہے

ہے سامنے پھولوں سے مہکتا ہوا گلشن
رضیہ کی تو پھر نہ کلی دل کی کھلی ہے

# ریحانہ روحیؔ کے شعری تحیّرات

تحیر و استفہام وہ بنیادی تلازمات ہیں جن سے علم و ادب کے ابواب وا ہوتے ہیں جس تخلیق کار کے ہاں یہ عوامل بکثرت ہوں گے وہ عمیق ادراکات کا حامل ہوگا استفہامیہ اور تحیراتی عمل ایک ایسا سمندر ہے جس میں غوطہ زنی کے بعد انسانی علم و فن کی نمو ہوتی ہے بقول راقم الحروف بحوالہ نظم ''رازِ نمو''

فن بے انت سمندر
پہلے ڈوبو
پھر نکلو گے

گویا تحیر وہ کلیدی تلازمہ ہے جو شعور و آگہی کے تصرف کی حیثیت اول قرار پاتا ہے جس پر افکار و تخیلات کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے ہم نے جب ریحانہ روحیؔ کے کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تو ہمیں ان کے شعری مخزن میں دولتِ تحیر فزوں تر نظر آئی ان کے شعری مجموعہ ''عشق زاد'' کے ربع اول کے منتخب غزلیہ اشعار شامل تجزیہ کرتے ہیں کتاب ہذا کی اشاعت جنوری 2000ء میں عمل میں آئی ان کا تعلق کراچی سے ہے کچھ عرصہ سعودی عرب میں بھی مقیم رہیں۔

ان کی قوتِ متخیلہ پر تجسس نوعیت کی حامل ہے اس لیے ان کے تخیلات میں استفسارات کی ایک وسیع و عریض دنیا آباد ہے انہیں ہر گام پر طرح طرح کے سوالات سجھائی دیتے ہیں جن کے جوابات کی وہ متلاشی نظر آتی ہیں وہ دنیا کی رنگارنگی سے مرغوب نہیں ہوتیں بلکہ اس کی بے ثباتی کا اظہار ان کے ہاں برملا انداز میں ملتا ہے ان کے ہاں جنون و خرد کے حوالے سے عمیق خیالات ملتے ہیں ان کے ہاں نادرالنظیر ترکیبات قاری کے لیے آغوش کشا نظر آتی ہیں جس سے ان کے بیان میں جدت و جاذبیت کے مظاہر جلوہ ریز ہوئے ہیں اسلوب کی چاشنی بھی ہے اور عمدہ درجے کی مضمون آفرینی بھی ہے عروضی اعتبار سے انہوں نے زیادہ تر مفرد اور رواں دواں بحور میں لکھا ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک خاص رنگ کا آہنگ اور موسیقیت آشکار ہوتی ہے اسلوبیاتی حوالے سے ایک شانِ دل آویزی ہے جو ان کی متنوع شعری طبع اور جودتِ طبع کی غمازی کرتی ہے ان کی ایک پوری غزل دنیائے شعر و سخن کے متوالوں کی نذر ہے ؎

یہ دنیا مان لو جادو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟
تماشا سا جو ہر اک سو ہے اس کے بعد کیا ہوگا؟
سنا ہے کچھ دنوں میں خشک ہو جائے گی کشتِ دل
ابھی تو آنکھ میں آنسو ہے اس کے بعد کیا ہوگا؟
گھنا جنگل جہاں چوبیس گھنٹے رات رہتی ہے
وہاں فی الحال تو جگنو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟
کھلے صحرا میں جب تک سر پہ سورج آ نہیں سکتا
جبھی تک پیاس پہ قابو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟
غنیمت ہے کہ اس آشوبِ ہجرت میں ابھی کچھ دن
ہماری ہمرہی میں تو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟
محبت ناقۂ ہستی میں مثلِ مشک ہے جب تک
جبھی تک زندگی خوشبو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟
کوئی تو حد ہے جس کے بعد کچھ باقی نہیں رہتا

سواب جو ہے بشرط ہو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟
دلِ وحشی کی سیمابی کے صدقے اب تلک روحیؔ
رمیدہ دشت میں آہو ہے اس کے بعد کیا ہو گا؟

حیاتِ انسانی طرح طرح کے خدشات سے دوچار ہے اور ہر گام ایک نئے جوکھم سے ہمکنار ہے اسی صورتِ احوال نے بنی نوعِ انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے چاہے جنوں کی دنیا ہو یا خرد کی خطرات ہمہ گیر حیثیت رکھتے ہیں دل کی دنیا نسبتاً زیادہ پر خطر ہوتی ہے اسی پرکٹھن کیفیت کی غمازی ریحانہ روحیؔ کی غزل کے مطلع میں دیکھتے ہیں ؎

دل کو رہ رہ کے یہ اندیشے ڈرانے لگ جائیں
واپسی میں اسے ممکن ہے زمانے لگ جائیں

فکری تغیرات شعری تجربات کی عمدہ تمثیل ہوتے ہیں وسیع پیمانے پر تغیراتی عمل افکار کی ندرت پر دلالت کرتا ہے ریحانہ روحیؔ کے ہاں بھی تجرباتی اور تغیراتی عوامل ساتھ ساتھ چلتے ہیں اسی حوالے سے ان کی غزل کے تین اشعار دیدنی ہیں ؎

غرورِ فتح میں مت بھولنا کہ دوسری سمت
غنیم دستہ بدلنے کے فن سے واقف ہے
عجیب تجربہ گزرا کہ دشتِ غربت میں
شجر بھی سایہ بدلنے کے فن سے واقف ہے
ہوئی چشمِ شناسا بھی اجنبی تو کھلا
کہ آنکھ رشتہ بدلنے کے فن سے واقف ہے

اُن کے کلام میں دولتِ تحیّر کے ساتھ ساتھ ایک غور و خوض کا عمل ملتا ہے جو ایک حیران کن کیفیت خود میں سموئے ہوئے ہے وہ حیات کے معماتی پہلو کو زیرِ غور لاتی ہیں جس سے ان کی پرتجسس شعری طبع کی عکاسی ہوتی ہے وہ زیست کے ہر پہلو کو سوچتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اسی نسبت کے ان کی غزل کے تین اشعار زیبِ قرطاس ہیں ؎

میں اپنی آنکھ میں جب اس کے خواب دیکھتی ہوں
تو خوشبوؤں سے چہکتے گلاب سوچتی ہوں
وہ سب سوال جو میری سمجھ سے باہر ہیں
میں جاگ جاگ کے ان کے جواب سوچتی ہوں
پلٹ کے دیکھتی ہوں جب رہ وفا کی طرف
تو عمر بھر کے دکھوں کا حساب سوچتی ہوں

ریحانہ روحی کی شعری پر اسراریت قاری کو حیرت و استعجاب کی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں انسان کو کچھ سجھائی نہیں دیتا یا اعجاز و افتخار ان کے شعری تجربات کی بدولت ہے انہوں نے زیست کی حیرتوں کو شعری پیرہن عطا کیا ہے اسی تناظر میں ان کی غزل کا ایک شعر لائق التفات ہے

؎

دورا ہے پہ کھڑی ہوئی یہ سوچتی ہوں میں
راہِ اماں کدھر ہے کدھر جانا چاہیے

ان کے بعض اشعار ایسے ہیں جن میں حیرت اپنی انتہا پر دکھائی دیتی ہے ان کا استعجابی انداز قابلِ ستائش ہے ایسے ہی افکار بہت کم شاعرات کے ہاں پائے جاتے ہیں زیست کی حیرتوں کا احاطہ کرنا بھی قابلِ حیرت امر ہے ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ کریں ؎

اے مصور آنکھ کی تصویر میں
کس طرح حیرت اتاری جائے گی

ریحانہ روحی کے کلام کے بنظرِ غائر مطالعہ سے یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ ان کے ہاں حیرت و استعجاب کا ایک جہان آباد ہے جو ان کی مقبولیت و پذیرائی کا جواز پیش کرتا ہے مزید شعری ریاضت ان کے لیے فزوں تر فکری و فنی بالیدگی کا باعث بنے گی جس کے باعث ان کے آدرش میں وسعت پیدا ہوگی اور وہ اپنے ادبی مقام و مرتبے کو بہتر انداز میں اجاگر کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔

# غزل

ریحانہ روحی، کراچی

کائنات اور آسمان کے درمیان ہوتا ہے کیا؟
کچھ نہیں ہوتا جہاں آخر وہاں ہوتا ہے کیا؟

جب چراغِ آرزو جلتا ہو دل کے طاق میں
کوئی کیا جانے کہ وہ روشن سماں ہوتا ہے کیا؟

فیصلہ پہلے ہی لکھا جا چکا جب لوح پر
پھر ہماری قسمتوں کا امتحان ہوتا ہے کیا؟

شہر والو! تم نے دیکھی ہیں مری بربادیاں
سچ بتاؤ کوئی یوں بے خانماں ہوتا ہے کیا؟

ایک ہی تو شخص ہوتا ہے بھرے سنسار میں
وہ نہیں ہوتا تو جانے پھر کہاں ہوتا ہے کیا؟

گھونسلہ جس کا اُٹھا کر لے گئے بچے شریر
کوئی اس چڑیا سے پوچھے آشیاں ہوتا ہے کیا؟

آج جو کچھ سامنے ہے بس حقیقت ہے یہی
ورنہ روحی کون جانے کل یہاں ہوتا ہے کیا؟

# غزل

ریحانہ روحی، کراچی

عجب حادثہ تھا قیامت گھڑی تھی
بچھڑنا کڑے امتحاں کی کڑی تھی

وہ عورت بھی آخر کو گھر دار نکلی
میں جس کے لیے سارے گھر سے لڑی تھی

وہ جب آسماں میرے شانوں سے پھسلا
زمیں اپنے محور پہ ساکت کھڑی تھی

میں جس وقت بیٹی سے ماں بن رہی تھی
میں اس وقت سارے جہاں سے بڑی تھی

ابھی جس کو جی بھر کے دیکھا نہیں تھا
اُسے دور جانے کی جلدی پڑی تھی

وہ خائف تھا مختیار ہوتے ہوئے بھی
میں محکوم ہو کر بھی ضد پہ اڑی تھی

مرا دل محبت کا مندر تھا روحیؔ
سو محلوں سے برتر مری جھونپڑی تھی

# ڈاکٹر زاہدہ تسنیم کی حقیقت پسندانہ شاعری

تجربات و مشاہدات شاہد ہیں کہ وہ سخن درجۂ مقبولیت و پذیرائی کو جلد حاصل کر لیتا ہے جو ہر قسم کے تصنع سے مبرا و ماورا ہے اور حقیقت پسندی سے مملو ہو جو بات دل میں آئے بے لاگ اور بے تکلف انداز میں کہہ دی جائے اس نوع کا شعری اظہار دل میں اتر جانے کی خصوصیت سے مالامال ہوتا ہے شذرہ ھٰذا میں ہم ایک ایسی شاعرہ کی سخن سازی کے حوالے سے رقم طراز ہیں جن کا کلام مذکورہ اوصاف سے متصف ہے یہاں ہماری مراد ڈاکٹر زاہدہ تسنیمؔ ہیں جن کا تعلق کراچی سے ہے ان کا اوّلین شعری مجموعہ ”خواب آنکھوں میں“ مطبوعہ جنوری ۱۹۹۸ء ہمارے زیرِ نظر ہے جو غزلیات اور آزاد نظمیات پر مشتمل ہے جس کے نصف اوّل کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار شاملِ تجزیہ ہیں ان کا مختصر مگر اجمالی سوانحی تعارف کچھ یوں ہے ان کی پیدائش ۱۰/ مارچ ۱۹۵۰ء کو کراچی میں ہوئی والد کا نام عبدالرحیم مدہوش رحمانی ہے ڈاکٹر مقصود احمد سے شادی ہوئی۔ غیر نامیاتی کیمیا میں ڈاکٹریٹ کیا۔ جامعہ کراچی میں تدریسی فرائض سر انجام دے رہی ہیں۔

ان کے شعری مجموعہ کے حوالے سے ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، نگار فاروقی، نیاز بدایونی، ڈاکٹر

اظہر رضوی کے تاثرات اور راغب مراد آبادی کے قطعات شاملِ کتاب ہیں۔

ڈاکٹر پیر زادہ قاسم نے زاہدہ تسنیم کی شاعری کے حوالے سے کچھ یوں اظہارِ خیال کیا ہے۔

زاہدہ نے کم عرصتی کی ساعتوں میں رہتے ہوئے زندگی اور انسانی جذبوں کی بہت پر کشش مگر بہت پُر اثر تصویر کشی کی ہے جس میں سچائی اور خلوص کے رنگ نمایاں ہیں یہی وجہ ہے کہ زاہدہ کی شعری کاوشیں اثر انگیزی کی بہت صلاحیتیں رکھتی ہیں۔

اُن کی غزل کا ایک شعر لائق توجہ ہے۔

ہزار بار پھرا ہے تو اپنے وعدوں سے
پھر اس کے بعد بھی ہر بار اعتبار کیا

ان کے افکار میں سچائی اور خلوص کے خصائص پائے جاتے ہیں تخیلات میں ایک سادگی اور کھرا پن ہے جو قاری کی توجہ مبذول کرانے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لیے اُن کا ہر شعر براہِ راست دل میں اُترتا چلا جاتا ہے نا کامی و نامرادی کے عالم میں بھی وہ پُرامید نظر آتی ہیں۔

نہیں ہے خوف مجھے اب کہیں بھٹکنے کا
ترے حصول کے سب راستوں میں شامل ہوں

زاہدہ تسنیم اپنے سخن کو رہینِ یاس نہیں ہونے دیتیں بلکہ رجا کی بارہ دری کو کھلا رکھتی ہیں جس سے اُن کے مشیت پر اعتماد کی عکاسی ہوتی ہے اور اُن کا قاری یاسیت کے چنگل میں گرفتار ہونے سے محفوظ و مامون رہتا ہے اس لیے امید افزا امکانات اُن کی خوش آئند فکر کے مظہر ہیں مگر کہیں کہیں فکری خلفشار اور گومگو کی کیفیات بھی اُن کی ذہنی ناآسودگی کو ظاہر کرتی ہیں۔

دربدر پھرتے رہیں ہر در ہمارا در لگے
اور کہیں رُک جایئے تو بے گھری قائم رہے

تسنیم کی شعر گوئی اُن کے تجربات و مشاہدات کا عکسِ جمیل ہے جس کی بدولت اُن کے سوانحی حالات کی بازیافت کا عمل سہل تر ہو جاتا ہے اور اُن کے ذاتی مصائب و آلام کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے ان کی شخصیت کے خلوص کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔

کتنی چاہت سے انھیں کی ہوئی جاتی ہوں کہ جو
میرے احساس کو پل بھر میں کچل دیتے ہیں

رومان نگاری بھی اُن کے کلام کا فطری اور فکری جزو ہے جس کے باعث وفاؤں کا مذکور بھی وفور سے اُن کے ہاں ملتا ہے معرفت کی نسبت مجاز کے شواہد بکثرت ملتے ہیں جن میں ہزیمت کے بھی متعدد پہلو پائے جاتے ہیں جو اُن کی عدم طمانیت کی تمثیلات پیش کرتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہے مجھ کو وفا راس نہیں
ہوں تو بے آس مگر اتنی بھی بے آس نہیں
میں نے روکا تو بہت اب نہ اُسے یاد کرے
کیا کروں دل کو مرے میرا کوئی پاس نہیں

زاہدہ کے ہاں خرد کی نسبت جنوں کی پاسداری اور عمل داری فزوں تر ہے جو اُن کی فکر کا کمزور ترین پہلو بھی ہے جس کے سبب یاس و حزن کے حوالے بھی بکثرت ملتے ہیں اور نسائی احساسات کا روایتی اظہار بھی ہے۔

ساتھ دیتا ہے یہاں کون ہمیشہ کے لیے؟
راہ بدلی تو یہ رہرو بھی بدل جائیں گے

اُن کے شعری کینوس میں بے پناہ اظہاری جسارتیں نمو پاشیاں کر رہی ہیں جو اُن کی حقیقت پسندی کی بین دلیل ہے اس لیے اُن کا لہجہ بے باک نوعیت کا ہے اور ہر قسم کی لگی لپٹی معدوم و مفقود ہے ایک ضبط کا یارا ہے جو انھیں بے حد پیارا ہے۔

عزیز مجھ کو بہت ہے تمھارا زہد کہ میں
خود اپنی پیاس بجھانے کو بھی کہیں راضی

تسلیم کے جذبات اعلیٰ و ارفع ہیں ایک اولوالعزمی ہے جو محیطِ سخن ہے کہیں بھی اُن کے عزم اور اصولوں کو ٹھیس نہیں پہنچتی اُن کے پایۂ استقلال میں لغزش بھی گریز پا نظر آتی ہے۔

ان کا اسلوب سلاست نگاری سے معمور ہے کہیں بھی اُن کی زبان ادق و دقیق اور گنجلک

نہیں ہو پاتی دقیقہ سنجی سے شعوری گریز کا پہلو بھی کار فرما ہے انتہائی آسان بھاشا میں سہل تر شبدوں کا استخدام کرتے ہوئے اپنے اظہار و مدعا کو سپردِ قرطاس کرتی ہیں ان کے تخیلات حقیقت پسندی کے جلو میں محوِ ارتقا ہیں مفرد و محذوف بحور کا استعمال فزوں تر ہوا ہے مزید ریاضِ شعر ان کے سخن میں نکھار افشانی کا سبب ثابت ہوگا۔

○

# غزل

### ڈاکٹر زاہدہ تسنیم، کراچی

ہم جو اک روح کا آزار لیے پھرتے ہیں
اپنی ہستی کو سردار لیے پھرتے ہیں

کتنے یوسف نظر آتے ہیں خیالوں میں سجے؟
آج ہم حسن کا بازار لیے پھرتے ہیں

تیرا انداز، تری یاد، ترا لطف و کرم
کون کہتا ہے کہ بے کار لیے پھرتے ہیں؟

ہم سا ظالم کوئی ہوگا کہ بہاروں میں بھی
دل کی وادی میں خس و خار لیے پھرتے ہیں

وہ وفاؤں کے طلب گار تھے کیا دور تھا وہ؟
آج خود اپنے طلب گار لیے پھرتے ہیں

# غزل

ڈاکٹر زاہدہ تسنیم، کراچی

یہ اشک جو مری خاموشیوں سے واقف ہیں
یہی تو ہیں کہ جو میرے دکھوں سے واقف ہیں

عجیب آئینہ تمثال شعر ہیں میرے
کہ میری ذات کے سب موسموں سے واقف ہیں

بچا کے سر کو نکلتے ہیں تیرے کوچے سے
کہ تیرے شہر کے سب دل جلوں سے واقف ہیں

نظر بچا کے گزرتے ہیں جو برابر سے
وہ میرے حال مری وحشتوں سے واقف ہیں

غمِ حیات غمِ عاشقی غمِ دنیا
ہمارے غم ہیں ہمیں ان غموں سے واقف ہیں

# زاہدہ رئیس راجی کا حقیقت پسندانہ سخن

فنِ شاعری میں فکر و تخیل کا استحکام و دوام سخن گستر کی بالیدہ فکری اور حقیقت پسندی کا مرہونِ منت ہوا کرتا ہے جو کلام ان خصائص سے عاری ہوتا ہے اُس کا تاثر زود رس اور دیر پا نہیں ہوتا مضمونِ ہذا میں ہم کراچی میں سکونت پذیر شاعرہ زاہدہ رئیس راجی کی شاعری کے حوالے سے خامہ فرسا ہیں جو فکری اعتبار سے حقیقت پسندی کے حسن سے مرصّع ہے اس وقت اُن کا اولین مجموعۂ کلام ''خواب گھروندا'' مطبوعہ 2014ء ہمارے پیشِ نظر ہے جس میں زیادہ تر غزلیات شامل ہیں تاہم کچھ پابند و آزاد نظمیات بھی کتابِ ہذا کا حصہ ہیں غزلیات کے منتخب اشعار میں سے چند استخراجات بطور استشہادات شاملِ شذرہ ہیں ۔

زاہدہ رئیس راجی کی شعری حسیات بسیط و بلیغ ہیں اُن کا حسیاتی کینوس اُن کے فکری عمق کا حامل ہے جس میں کچھ فلسفیانہ زاویے بھی پنہاں ہیں جسے اُن کی ذہانت اور نگاہِ ژرف بیں کا کمال کہا جا سکتا ہے جس میں اُن کا عرفانِ حقیقت بھی پنہاں ہے ۔

جب فنا ہوکر بقا کی کھوج کی
مل گیا دل کو خدا کا راستہ

عصرِ حاضر میں ایک بے یقینی اور فکری انتشار کی فضا پائی جاتی ہے خلوص و مروت عنقا ہے فریب اور دھوکا دہی کو فروغ حاصل ہے محبتوں کے اعتبار کی بساط کدورت اور بے مروتی کے ہاتھوں لپیٹ دی گئی ہے ایک عدم اعتماد کی فضا ہے جو محیطِ حیات ہے۔

لہو لہو ہے یقیں کا وجود الفت میں
محبتوں کا نہیں اعتبار آنکھوں میں

عہدِ حاضر کا انسان ایک عجیب و غریب بے راہ روی کا شکار ہے حیاتِ انسانی میں مقصدیت کا فقدان ہے تعیُّنات کے تمام تر پیمانے معدوم ہو چکے ہیں ایک گومگو کا عالم ہے جو طاری ہے اور ایک مسافتِ بے کراں ہے جو محیطِ زیست ہے۔ بقول راقم الحروف:

مجھے ناروا کہیے آوارہ کہیے
مرے سامنے کوئی منزل نہیں ہے
مجھے ساتھ لے جا رہی ہیں وہ موجیں
کہ جن کے مقدر میں ساحل نہیں ہے

اسی نوع کی لاحاصلی کا مذکور زاہدہ رئیس راجی کے ہاں کچھ یوں ملتا ہے:

کوئی سایہ نہیں اس رہگزر میں
نہ منزل ہے کوئی حدِ نظر میں
نہ ٹھہرو گے کبھی تم رہگزر پہ
رہیں گے عمر بھر ہم بھی سفر میں

اُن کے افکار کا کمال حقیقت پسندی یہ ہے کہ اُن کا شعری اظہار ہر طرح کے تصنع کی حاشیہ آرائی سے محفوظ و مامون ہے انھوں نے عصری بے حسی کے موضوع کو بھی انتہائی قرینے سے برتا ہے محبت کی حقیقت و ماہیت کو انھوں نے عمیق نظری سے مشاہدہ کیا ہے۔

محبت آڑ ہوتی ہے دلوں کو باندھ رکھنے میں

محبت بوجھ بن جائے تو رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

اجتماعی خود انتقادی اور احتسابی رویہ اُن کی غیر جانب دارانہ سوچ کی عکاسی کرتا ہے اس لیے وہ حقیقت و صداقت کا علم بلند کیے ہوئے ہیں یوں سیرت سازی میں مصروفِ خدمت نظر آتی ہیں۔

جھوٹ کی اس دنیا میں ہم سب جھوٹے ہیں
سچ اپنی بنیاد نہ جانے کب تک ہو؟

حیات کی بے ثباتی کا مذکور ہر ور نے اپنے اپنے زاویہ فکر کے اعتبار سے کیا ہے یہ موضوع ایک عالم گیر حقیقت کا درجہ رکھتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے جس کو اپنے مخصوص انداز میں یوں برتا ہے:

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

زاہدہ رئیس راجی نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے۔

مشتمل ہے چار سانسوں پہ دوامِ زندگی
اور صدیوں کے برابر دل کا ہر ارمان ہے

راجی کا کلام روایت آمیز ہے اور روایت آموز بھی ہے۔ وہ میراثِ اسلاف پر فاخر و نازاں نظر آتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے تخیلات میں شرقیت کی واضح جھلک محسوس ہوتی ہے

زاہدہ رئیس راجی نے سادہ و شستہ اسلوب میں مدعا نگاری کی ہے جس میں حقیقت پسندی کے مظاہر مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں ابھی انھیں فکر و فن کے ہفت اقلیم کا سفر درپیش ہے جس کے لیے انھیں مستقل ریاضت اور لگن مطلوب ہے۔

◆

# غزل

زاہدہ رئیس راجی، کراچی

وقت کی قید سے چپ چاپ نکلنے والے
ہم سرِ شام نہیں رات میں ڈھلنے والے

جستجو ذات سے آغاز ہوئی تھی لیکن
زیست کی راہ میں سو بھید تھے کھلنے والے

است اور نیست کے مابین کھڑی تھی دنیا
اُس پہ ہم لوگ تھے ابہام پہ چلنے والے

درد کی دھوپ اگر سایۂ دیوار ہے
ہم بھی کترا کے نہیں راہ بدلنے والے

غم غلط کرنے کے ڈھونڈیں گے بہانے کیا کیا؟
عمر بھر درد سے آنکھوں کو مسلنے والے

حوصلے باندھ کے رکھے تھے ہمیشہ راجیؔ
کب مصائب تھے مرے وقت پہ ٹلنے والے؟

# غزل

زاہدہ رئیس راجی، کراچی

خراج مجھ کو ملے مرے ہنر کے لیے
دعا کرو مرے ہر لفظ میں اثر کے لیے

یہ شاعری تو ہے لفظوں کی چاشنی لیکن
جگر کا خون بھی درکار ہے اثر کے لیے

ہمارے ساتھ دعاؤں کا سائبان تو ہے
بچا کے رکھیں جسے آخری سفر کے لیے

دکھائے کتنے ہی در ہم کو زندگانی نے؟

وفورِ غم میں فقط سایۂ شجر کے لیے

ہمیں وہ بھول گیا ہے مگر فقط اتنا
چلا گیا تھا کوئی جانے کب کدھر کے لیے؟

سوال کتنے کیے تھے جواب کی خاطر
ملا جواز نہ کوئی نگاہِ تر کے لیے

عجیب پیاس کا صحرا ہے آدمی راجیؔ
ہر ایک شخص ترستا ہے اک نظر کے لیے

# شبنم شکیل کے عمرانی رویّے

عقلِ انسانی ابتدائے آفرینش سے محوِ ارتقا ہے سوچ کے زاویے اور انسانی ترجیحات روبہ تغیر رہتی ہیں شعر و ادب کے شعبہ نے بھی ایک مسلسل ارتقائی عمل کے بعد موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ ہر عہد کے شعری رجحانات و میلانات مختلف رہے ہیں۔ کبھی ادب برائے ادب کے نظریہ کو فوقیت حاصل رہی تو کبھی ادب برائے زندگی کی بحث اہمیت اختیار کر گئی عصری شعری روش میں ادب برائے زندگی کو سبقت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ موجود کی شاعری میں سماجی ادراکات اور عمرانی رویے وفور سے در آئے ہیں آج ہم لاہور سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی سخن ور کے حوالے سے خامہ فرسائی پہ مامور ہیں جن کے سخن میں عمرانی ادراکات اور سماجی رویے بکثرت

پائے جاتے ہیں یعنی ہماری مراد شبنم شکیل جیسی مہان شعری شخصیت ہیں جو اقلیمِ سخن میں اپنی ایک منفرد پہچان رکھتی ہیں اس وقت اُن کا دوسرا شعری مجموعہ ''اضطراب'' مطبوعہ 2004ء ہمارے محلِ نظر ہے جس میں زیادہ تر غزلیات و آزاد نظمیات شامل ہیں تاہم کچھ پابند نظمیں اور فردیات بھی کتاب مذکور کا حصہ ہیں کتاب ھٰذا کے نصف اوّل کی غزلیات کے منتخب اشعار موضوع کی مناسبت سے برائے تجزیات شاملِ مضمون ہیں واضح رہے کہ قبل ازیں اُن کا ایک مجموعۂ کلام ''شب زاد'' سے موسوم زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔

عصرِ حاضر میں نفسا نفسی، خود غرضی اور خود پسندی کے باعث اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل چکا ہے بے حسی، بے مروتی اور کج روی اپنے عروج پر ہے معاشرے میں باہمی محبت و مروت کے احساسات قصۂ پارینہ بن چکے ہیں اگر کہیں اخلاص و ہمدردی کا وجود بھی ہے تو وہ محض رسمی کارروائی کے زمرے کا حامل ہے شبنم شکیل نے بھی کچھ اس نوع کے جذبے کی پچا عنائی ہے۔

سوچا تھا میرے دکھ کا مداوا کریں گے کچھ
وہ پرسشِ ملال سے آگے نہیں گئے

ہر زمانے میں قحط الرجال کی شکایت رہی ہے اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم اربابِ کمال کا عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں ہم زبانی کلامی تو اُن کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں اور ایک جہاں اُن کا گرویدہ ہوتا ہے لیکن اُن کے حوالے سے عملی اقدامات یکسر نہیں ہو پاتے ہمارا یہ طرزِ عمل ہمارے دُہرے رویے، ذہنی پسماندگی اور سماجی زوال کی علامت ہے۔

خوابوں سے محروم رہا کرتے ہیں دنیا جیت کے بھی
ایک کمی اکثر یہ رہ جاتی ہے جاگنے والوں میں

زیست ایک مسلسل سفر ہے جو کبھی جامد نہیں ہوتا اس لیے حیات کو تحرک سے نسبت ہے اور جمود مرگ سے مملو ہے زندگی کا یہ وصفِ زریں اس کا فطری کمال ہے جو کبھی کے رہینِ زوال نہیں ہوتا جیون کے سفر میں ٹھہراؤ محالات کا حصہ ہے۔

چلتے رہے تو کون سا اپنا کمال تھا؟
یہ وہ سفر تھا جس میں ٹھہرنا محال تھا

شبنم شکیل کے افکار میں ایک ماورہ کاری کا احساس پنہاں ہے ان کی فکری اپج عمومی ڈگر سے ہٹ کر ہے ان کے سوچنے کا انداز جداگانہ حیثیت کا حامل ہے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سماج محبت کا دشمن ہے لیکن یہ جذبہ کبھی فنا نہیں ہوتا لیکن ان کا اس کے برعکس نقطۂ نظر ملاحظہ کریں:

یہ مرجاتی ہے اپنی موت خود ہی
محبت کا کوئی دشمن نہیں ہے

جوں جوں پیمانۂ حیات لبریز ہوتا ہے تو انسان کے اندر زمانہ شناسی اور سماجی ادراکات کے خصائص نمو پاش ہونا شروع ہو جاتے ہیں انسان کی بالیدگی افکار فزوں تر ہو جاتی ہے حیات و کائنات سے انسانی آگہی وسعت اختیار کر جاتی ہے تو انسان میں زندگی کرنے کا شعور عمق کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے کچھ یہی معاملہ شبنم شکیل کا بھی ہے۔

زمانہ ساز ہوتی جا رہی ہوں
مجھے روکو سنبھلتی جا رہی ہوں

شبنم شکیل کا اسلوب ترفع کا حامل ہے جو اپنے موضوع کے تابع نظر آتا ہے جس میں ایک سنجیدگی کا غالب عنصر کارفرما ہے ان کی فکر میں بالیدگی اور متانت محوِ عمل نظر آتی ہے انھوں نے مفرد و محذوف اور مرکب بحور میں انتہائی کامیابی کے ساتھ عروضی تقاضے نبھائے ہیں وہ اپنی تہذیب و تمدن کا بسیط شعور رکھتی ہیں ان کی شاعری میں سماجی رویوں کی بازگشت ان کے عصری شعور کو آشکار کرتی ہے امید ہے کہ شعری تاریخ کے ہر عہد میں ان کا کلام زندہ و تابندہ رہے گا۔

○

# غزل

**شبنم شکیل، فیصل آباد**

پہلے تو اپنا گم شدہ لشکر تلاش کر
پھر رہزنوں کی تیغِ ستم گر تلاش کر

اس کے بغیر خود تری پہچان کھو گئی
کل جس میں رہ رہا تھا وہی گھر تلاش کر

اے شہرِ سنگ دل کے مکیں سوچتا ہے کیا؟

پتھر اُٹھا کے کانچ کا پیکر تلاش کر

رکھ دار و گیر میں پسِ پردہ تلاشِ خیر
دل لاکھ ورغلائے کہ تو شر تلاش کر

جو روشنی کی سمت کھلے اور کھلا رہے
دیوارِ قصرِ دل میں وہ اک در تلاش کر

لفظوں کی بازی گر ہوں مجھے شاعری سے کیا؟
اپنی ثنا کو کوئی سخن ور تلاش کر

# غزل

**شبنم شکیل، فیصل آباد**

جسم و جاں کی روشنی تو میری دشمن بن گئی
دوست ہوکر زندگی تو میری دشمن بن گئی

ایک پل میں مجھ سے مانگا لمحے لمحے کا حساب
ساعتِ خود آگہی تو میری دشمن بن گئی

زندگی بھر تونے اپنے سحر میں رکھا اسیر
حرف کی نیلم پری تو میری دشمن بن گئی

دوسروں کے واسطے کتنا لہو میرا بہا؟
شاعری اے شاعری تو میری دشمن بن گئی

دہر کی آسائشیں بے رنگ ہو کر رہ گئیں
روح کی آسودگی تو میری دشمن بن گئی

چھین لی اک چھپ دکھا کر مجھ سے بینائی مری
عشق کی تابندگی تو میری دشمن بن گئی

# صالحہ کوثر کا صد رنگ سخن

فنِ شاعری میں افکار کی رنگارنگی اور بوقلمونی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے جس سے کسی سخن ور کی وسعتِ تخیل کا اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے کلام میں یکسانیت سے گریز اور نیرنگی وہ حسین عناصر ہیں جو سخن کو معتبر اور وقیع بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں بقول شاعر:

میں نے اس اک رنگ میں سو رنگ بھرے ہیں فاتح
اک نیرنگ لیے ہے میرے افکار کا رنگ

آج ہم کراچی میں سکونت پذیر ایک ایسی شاعرہ کے حوالے سے رقم طراز ہیں جن کا کلام

اسی زمرے میں آتا ہے یعنی ہماری مراد صالحہ کوثر ہیں جو اس وقت ہمارے درمیاں نہیں ہیں ان کا دوسرا شعری مجموعہ ’’سرو و چنار کا موسم‘‘ مطبوعہ 2006ء ہمارے زیرِ نظر ہے جو تمام تر غزلیات پر مشتمل ہے جس سے اُن کی غزل سے گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے واضح رہے کہ قبل ازیں ان کی ہائیکوز کا مجموعہ ’’وادی پھولوں کی‘‘ بھی منصۂ شہود پر آچکا ہے اُن کے آباو اجداد و اجداد حیدرآباد دکن کے شاہی خاندان اتالیق رہے خصوصاً ان کے والد نسیم صدیقی حیدرآباد دکن کے ادبی حلقوں میں نمایاں پہچان رکھتے تھے ان کے اول الذکر شعری مجموعے کے ثلث اول کی غزلیات کے اشعار منتخبہ مذکورہ موضوع کے تناظر میں بطور استشہادات اور کچھ استخراجات شامل شذرہ ہیں۔

صالحہ کوثر کے شعری کینوس میں پھول، خوشبو، بہار، رنگ، مستی، نظارے، کلیاں، گلشن اور حسنِ نگار کے تذکرے ہیں یہ عوامل اُن کے سخن کی صد رنگی کو جہاں فزوں تر کر رہے ہیں وہاں اُن کے فکری کینوس کو خوش گوار و طربیہ اور پُر کیف بنا رہے ہیں۔ اُن کا شعری مزاج سدا بہار نوعیت کا حامل ہے۔

ہر ایک سمت ہے خوشبو ہوا میں خنکی ہے
کھلے ہیں پھول کہ آیا بہار کا موسم
نظر میں رنگ ہے مستی بھرے نظارے ہیں
اسی کو کہتے ہیں دل کے قرار کا موسم
وہ دیکھو کھل گئیں ساری ہی کلیاں گلشن کی
سنبھل اے دل یہ ہے حسنِ نگار کا موسم

اُن کے سخن میں امید کے ہالے ہیں اور زندگی سے بھرپور محبت کے حوالے ہیں طرب و تمکنت کی فضا ہے خوشبو کا تذکرہ ہے بہار کی نوید سعید ہے۔

اے خوش بو میری ہر اک سانس میں تو زندگی بھر دے
کوئی جادو بھرا نغمہ سنا پھر سے بہار آئی

صالحہ کوثر کے ہاں بھرپور نوعیت کی رومانویت ہے بہار ساماں تشبیہات کا استخدام عمومیت

اور عمدگی کے پیرائے میں ہوا ہے جو اُن کے فطری طرزِ سخن کی عکاسی کرتا ہے۔

ترکِ الفت کی خطا کیسے کروں؟
پھول سے خوشبو جدا کیسے کروں؟

عصرِ حاضر میں جہاں تخیل کی فضا پُرخون و پُرملال ہے جہاں رجائی امکانات اپنی بساط لپیٹ چکے ہیں ایسے مہیب ماحول میں آرزو، زندگی، خوشبو، نغمہ اور تازگیِ گل یہ وہ عناصر ہیں جو اُن کے سخن کی صدرنگی میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔

مجھے تم آرزو کہنا مجھے تم زندگی کہنا
کبھی خوشبو، کبھی نغمہ گلوں کی تازگی کہنا

صالحہ کوثر کا سخن اگرچہ سدا بہار نوعیت کا ہے لیکن کہیں کہیں محرومیِ ذات کی پرچھائیاں بھی عکس افشانی کر رہی ہیں جو اُن کے سخن کی حقیقت پسندی کی دلیل ہے۔

بہارِ گل تو جیسے چار سو ہے
مری ہستی ہی شاید کم نمو ہے

انھوں نے اپنے قاری کے لیے اپنے کلام کے ذریعے فکر کی ایک مسحور کن فضا مہیا کی ہے جہاں معرفت و مجاز کی جلوہ ریزی با آسانی ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

رنگ و خوشبو کی حقیقت جانی
روپ میں تیرے گلستاں دیکھا

صالحہ کوثر نے اگرچہ عروضی اعتبار سے زیادہ تر بحرِ ہزج کے مختلف اوزان میں شاعری کی ہے تاہم دیگر مفرد و محذوف اور مرکب بحور میں بھی سخن سنجی کی ہے اُن کی اسلوبیاتی سطح قاری کے فکری میلانات و رجحانات سے زیادہ ہم آہنگ ہے اُن کے کلام کا صدرنگ اندازِ فکر اُن کے مثبت فکری زاویوں کا غماز ہے۔

○

# غزل

صالحہ کوثر، کراچی

ساری کوشش ہے آگہی کے لیے
جی رہی ہوں میں زندگی کے لیے

جب حقیقت کھلی تو یہ جانا
دوستی کی تھی دشمنی کے لیے

مقصدِ زندگی حیات مری
جان قربان زندگی کے لیے

اپنا ایمان جو بچا نہ سکے
ٹوٹے دنیائے عارضی کے لیے

کہہ گیا دار پر سرِ منصور
چاہیے ظرف راستی کے لیے

اس سے تسکینِ روح ہوتی ہے
شعر کہتی ہوں میں خوشی کے لیے

جاں کی پرواہ نہیں مجھے کوثرؔ
ہے سفر میرا زندگی کے لیے

# غزل

صالحہ کوثرؔ، کراچی

تقسیم جو متاعِ سخن کر رہے ہیں ہم
سمجھے کوئی تو خدمتِ فن کر رہے ہیں ہم

اک دوسرے کے واسطے جینے میں ہے مزا
اس طرح اپنے گھر کو چمن کر رہے ہیں ہم

ہوگا زمانہ اپنے مقابل یقین ہے
جب ختم کوئی رسمِ کہن کر رہے ہیں ہم

اپنا خمیر جس سے اُٹھا حق وہی تو ہے
اپنی زمیں کو وقف یہ تن کر رہے ہیں ہم

ایذا رسانی ہم وطنوں سے بجا مگر
آندھی کی زد میں اپنا چمن کر رہے ہیں ہم

کوثر جو کہہ رہی ہے ذرا غور سے سنو
پیدا خود انتشارِ وطن کر رہے ہیں ہم

# ڈاکٹر صغرا صدف کا تخلیقی وجدان

تخلیق تخیل اور تخیل سے عبارت ہے اور تخیل کو خیال سے نسبت ہے فنِ شاعری میں جس شاعر یا شاعرہ کے ہاں افکار میں جس قدر وفور اور تنوع پایا جاتا ہے اس کا تخلیقی وجدان بھی اس قدر بسیط و عمیق ہوتا ہے اکثر و بیشتر شاعرات کے احساسات چند مخصوص قسم کے موضوعات کے گرد گھومتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے ہاں فکری وسعت کا اہتمام نہیں ہو پاتا کسی کے آدرش کی وسعت کا اندازہ اُس کے موضوعات سے لگایا جاتا ہے شذرہ ھذا میں ڈاکٹر صغرا صدف کے شعری مجموعہ ''وعدہ'' کے ربع اول کے منتخب غزلیہ اشعار میں سے اُن کے تخلیقی وجدان کی صراحت کرتے ہیں ڈاکٹر صغرا صدف

کا تعلق لاہور سے ہے "وجدان" نامی ادبی جریدے کی ادارت بھی کرتی رہی ہیں اس کے علاوہ شام و سحر، ارژنگ اور دیگر متعدد ادبی جرائد میں بھی ان کا کلام تواتر سے چھپتا رہتا ہے بین الاقوامی طور پر مشاعروں میں بھی شرکت کرتی ہیں۔

اَن کے ہاں رومانوی افکار بھی کثرت سے ملتے ہیں اَن کا طرزِ اظہار جداگانہ ہے اَن کے کلام میں وہ تاثیر ہے کہ قاری کے دل پر براہِ راست اثر کرتا ہے اَن کی غزل کے چار اشعار دامنِ دل تھام رہے ہیں ؎

اِس دشتِ آرزو میں بکھرنے تو دے مجھے
اعلان وحشتوں کا وہ کرنے تو دے مجھے
یہ میرا مسئلہ ہے کہ کیسے کروں قیام؟
پہلے وہ اپنے دل میں اترنے تو دے مجھے
دیکھے تو ایک بار مجھے وہ بھی پیار سے
تکمیل اپنی ذات کی کرنے تو دے مجھے
قطرے سے میں بنوں گی سمندر مگر صدف
یہ شرط ہے وہ جاں سے گزرنے تو دے مجھے

وہ عمومی احساسات کو مخصوص شعری پیرہن عطا کرتی ہیں عمومیت اَن کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے اَن کے شعور کی کئی پرتیں ہیں کئی پہلو ہیں جو تہہ در تہہ کھلتے چلے جاتے ہیں رومان اَن کے کلام کا مستقل حوالہ ہے رومان نگاری کی ذیل میں ان کی غزل کے دو اشعار دیکھتے ہیں ؎

نقصان تیرے دھیان میں اکثر ہوا مرا
ہاتھوں سے گر کے ٹوٹ گیا آئینہ مرا
وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میں خوش ہوں اس کے ساتھ
واقف نہیں ہے درد سے درد آشنا مرا

اَن کے ہاں روحِ عصر کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے کہیں کہیں اَن کا تخیل قبائے کرب و سوز اوڑھ لیتا ہے کہیں حزن و ملال عروج پر پہنچا ہوا ملتا ہے پر آشوب کیفیات کا بیان بھی دامنِ دل

تھام لیتا ہے۔ ان کی غزل کے پانچ حزنیہ اشعار جو عصرِ حاضر کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں زیبِ قرطاس ہیں ؎

مقتل بنا ہوا ہے مرا شہر ان دنوں
اب راہ سوجھتی نہیں کوئی نجات کی
سانسیں ہیں زخم زخم موسم ہیں بے ردا
دہرا رہا ہے وقت کہانی فرات کی
پہلے قدم قدم پہ بہاروں کا راج تھا
اب خون میں نہاتی ہے وادی سوات کی
صحنِ وطن میں ایسا اندھیرا بکھر گیا
دن کا شعور مجھ کو نہ پہچان رات کی
بے خواب موسموں میں لٹا قافلہ مرا
اپنے ہی لکھ رہے تھے کہانی یہ مات کی

خیالات کا مجسم ہونا کسی اعجازِ مسیحائی سے کم نہیں اور تخیل کی نادرہ کاری اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے شعر کی ایک بہت بڑی خوبی اس کی پہلوداری بھی ہوا کرتی ہے کہ وہ معرفت و مجاز کے سانچے میں ڈھل جائے۔ اسی حوالے سے ان کی غزل کا ایک شعر لائقِ توجہ ہے ؎

اس نے مرے خیال کو تجسیم کر دیا
وہ جو دکھائی دیتا ہے مجھ کو چہار سو

ہر دور میں عشق وجہِ بے کاری سمجھا جاتا رہا ہے جیسے مرزا اسد اللہ غالب نے کہا تھا ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ان کے ہاں عشق کی تباہ کاریوں کا بیان بھی ہے اور آرزوؤں کا کرب بھی ہے۔ حسرتوں کا ماتم بھی ہے۔ ان کے علاوہ ان کے ہاں رجائی حوالے بھی ملتے ہیں حالات جیسے بھی ہوں امید کی کرن زندگی کرنے کا ولولہ بخشتی ہے۔ اسی نسبت سے ان کی غزل کے تین اشعار دیدنی ہیں ؎

جینے نہیں دیا مجھے مرنے نہیں دیا
کوئی بھی کام عشق نے کرنے نہیں دیا
میری ہتھیلیوں پہ بھی سورج تھے بے شمار
لیکن انہیں کسی نے ابھرنے نہیں دیا
میرے لیے تو زندگی جنگل کی رات ہے
پر اس کی یاد نے تو ڈرنے نہیں دیا

متعدد شعری مجموعوں کی خالق اور بین الاقوامی مشاعروں میں شرکت کرنے والی یہ شاعرہ بے پناہ شعری اوصاف کی حامل ہے بین السطور کافی دلچسپ کیفیات کے اشعار ور دل پر دستک دینے لگتے ہیں قاری پر ان کے تخلیقی رجحانات گہرے اثرات چھوڑتے ہیں ایسے سخنور بساطِ فکر وفن میں لائق اکرام ہوا کرتے ہیں۔

# غزل

**ڈاکٹر صغرا صدف**، لاہور

تھی نظر کو جمال کی خواہش
دل میں جاگی وصال کی خواہش

پھر اسی گنبد اماں کی طرف
کھینچ لائی کمال کی خواہش

اُس رُخ آرزو پہ چمکی ہے

آج پھر ہے جمال کی خواہش

سامنے تھا سخی کا دروازہ
کون کرتا سوال کی خواہش؟

سانس تسبیح میں تھی اور مجھے
لمحہ لمحہ زوال کی خواہش

اس نظر کا ہنر ، عطا کر دے
ہے یہی ماہ و سال کی خواہش

پھر صدفؔ جھومنے لگی مجھ میں
دم بہ دم اک دھمال کی خواہش

# غزل

**ڈاکٹر صغرا صدفؔ، لاہور**

جو بن گیا وہ تعلق بحال رکھنا ہے
تری نشانی کو دل میں سنبھال رکھنا ہے

سجا کے رکھنی ہے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بھی
نظر کی اوٹ میں تیرا ملال رکھنا ہے

میں سوکھنے نہیں دوں گی شجر محبت کا

سو دھیان اس کا مجھے ڈال ڈال رکھنا ہے

جدا نہ ہوں گے نگاہوں سے خدوخال اس کے
کہ دل کشی کو جدائی میں ڈھال رکھنا ہے

جو اس کے ہاتھوں سے اوڑھا تھا میں نے وصل کی شب
تمام عمر وہ آنچل سنبھال رکھنا ہے

یقین کرنا ہے بے لوث اس کی چاہت کا
کہ دل سے وہم و گماں کو نکال رکھنا ہے

میں اس کی چاہ میں سرشار ہو گئی ہوں صدفؔ
مجھے تو ماضی کی چوکھٹ پہ حال رکھنا ہے

# ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی آس سخن ورِ درد و رنج

حیاتِ انسانی دن بدن پیچیدگی اختیار کرتی جا رہی ہے جس کے باعث اس کے مسائل و آلام فزوں تر ہوتے جا رہے ہیں یہی سبب ہے کہ طربیہ احساسات، خوش گوار و لطیف جذبات اور زندہ دلی کے شواہد مفقود ہوتے جا رہے ہیں جس کے لازمی نتیجے کے طور پر زندگی کے دیگر شعبہ جات کی طرح فنونِ لطیفہ بھی بری طرح متاثر ہوئے ہیں ادب عموماً اور شاعری خصوصاً ان اثرات

سے محفوظ نہ رہ سکی یہی وجہ ہے ہمارا کثیر شعری سرمایہ حزنیہ اور المیہ طرزِ فکر کا حامل ہے متقدمین و متوسطین و متاخرین میں یہ شواہد وفور سے ملتے ہیں آج ہم جس شاعرہ کی سخن سازی کے حوالے سے خامہ فرسا ہیں اُن کا فکری کینوس بھی قبائے درد و رنج اوڑھے ہوئے ہے یہاں ہماری مراد ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی آسؔ ہے جن کا تعلق کراچی سے ہے آپ ۵/ دسمبر ۱۹۷۶ء میں پیدا ہوئیں ایم اے صدیقی مرحوم ان کے والد گرامی تھے جو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے جب کہ اُن کی والدہ کے بزرگوں کا مسکن دہلی تھا ان کی والدہ اور والد نے ان کی اوائل عمری میں تعلیم و تربیت پہ خصوصی توجہ دی اپریل ۲۰۱۴ء میں شاہد حسین بلوچ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں ان کا بیشتر کلام فکری حوالے سے حزن و ملال سے عبارت ہے ''پیار پھول اور بارش'' کے نام سے ان کا اوّلین مجموعۂ کلام ۲۰۱۲ء میں زیرِ طباعت سے آراستہ ہوا جس میں ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی آسؔ کے شاعری کے حوالے سے سحر انصاری اور امجد اسلام امجد کے تاثرات شامل ہیں کتاب ھذا زیادہ تر غزلیات و آزاد نظمیات پہ مشتمل ہے۔

آسؔ کے فکری کینوس میں حزن و الم کی پونجی وافر ہے انھوں نے اپنی شاعری میں صنعتِ مبالغہ کو بکثرت برتا ہے جس کے باعث تاثر اور زورِ بیاں فزوں تر ہوا ہے ان کا اظہار داخلی نوعیت کا ہے جس میں دل اور کیفیاتِ دل کے حوالے وفور سے ملتے ہیں وہ سنسار کو حزنیہ زاویوں سے دیکھتی ہیں اس لیے اُن کے ہاں یاسیت کی فضا پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے وہ جلد پریشان ہو جاتی ہیں مایوسی و افسردگی ان کے احساسات پہ چھائی ہوئی ہے۔

ایک رومانوی غم ہے جو اُن کی شاعری سے آشکار رہتا ہے ان کے افکار میں درد کی آنچ شدید نوعیت کی ہے طربیہ اور رجائی امکانات ان کے ہاں معدوم ہیں ان کا تصورِ غم صرف محرومیوں پہ محیط نہیں ہے بلکہ وہ زیست کو حزنیہ زاویوں سے دیکھتی ہیں قنوطیت ان کے شعری مزاج کا حصہ بن چکی ہے گویا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آس کی شاعری میں آس نہیں بلکہ یاس کارفرما ہے جس میں درد و رنج کے فزوں تر حوالے ملتے ہیں ابھی اُن کے شعری سفر کا نقطۂ آغاز ہے اپنے کلام کے فکری و فنی معیار کو بہتر بنانے کے لیے انھیں وسیع المیعاد ریاضت اور عرق ریزی درکار ہے فکر و فن کے دشتِ خارزار میں انھیں معتبر راہنمائی مطلوب ہے ان کے مذکورہ شعری مجموعہ سے

نمونہ کلام کے طور پہ چند اشعار موضوع کی مناسبت سے قارئین کے خوانِ شعور پہ دھرتے ہیں۔

دل ہوا ہے لہو لہو اپنا
چشم نے اشکِ خوں بہائے ہیں
پھر برسنے کو دل گھروندے پہ
غم کے بادل بھی گھر کے آئے ہیں

☆

بے چینی انجان سی ہے
دنیا اب ویران سی ہے

☆

دل کی وحشت سے رابطہ ہی رہا
اب تو اندر یہ دم ذرا ہی رہا

☆

چاہ محبت گہرا ہے
درد کا اس پہ پہرا ہے

☆

لمحہ لمحہ ہر قدم ہر سانس ہے اک امتحاں
زندگی کو سہل اور سادہ سفر سمجھی تھی میں

☆

اونچے محلوں میں رہنے والے لوگ
گھر کے ہوتے ہوئے بھی بے گھر تھے

☆

شدت زخم کی ایسی ہے
مرہم بھی دُکھ پہنچائے

# غزل

ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی آسؔ، کراچی

تیری یاد میں مستی ہے
تو ہی پیاری ہستی ہے

ساتھ جہاں مل جائے تو
وہ تو پیار کی بستی ہے

مالا میرے آنسو کی
سب چیزوں سے سستی ہے

اُس کے دل میں کیسے بسوں؟
جس میں دنیا بستی ہے

جھانکوں اپنے اپ میں کیا؟
یہ تو اُجڑی بستی ہے

آسؔ وہ تم کو چھوڑ گیا
اب تنہائی ڈستی ہے

# غزل

ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی آسؔ، کراچی

جس جگہ دشمنوں کے لشکر تھے
ہم نے دیکھے وہاں ترے در تھے

اُن کے انداز سے پتہ نہ چلا
چارہ گر تھے کہ وہ ستمگر تھے

پھر کے آخر کو وہ چھلک ہی گئے
آنکھ کے جام ایسے ساغر تھے

ایک حسرت نہ بن کے رہ جائے
کچھ بچایا نہ جب تونگر تھے

آس لگتے تھے کیوں تمھیں مضبوط؟
وہ جو مٹی کے بھربھرے گھر تھے

# طلعت اشارت کے شعری ادراکات

اقلیم شعر جذبات و احساسات سے عبارت ہے جس سخن گستر کے تخیلات میں ایک ندرت و تازہ کاری کا احساس کارفرما ہو اُس کا کلام ادراکاتِ حیات سے مرصع ہوتا ہے اور تادیر زندہ رہتا ہے اسی قبیل سے تعلق رکھنے والی شاعرات میں ایک نام طلعت اشارت کا بھی ہے جو ہنوز طبعی طور پر ہمارے درمیاں موجود نہیں ہے جنھوں نے 2011ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کیا لیکن اُن کی

شاعری ہمیں انھیں فراموش نہیں کرنے دیتی بلکہ تواتر سے ان کی یاد دلاتی رہتی ہے جن کے تادمِ تحریر تین شعری مجموعے ”اشارت“، ”سرمایہ“ اور ”منجمد لمحے“ منصۂ شہود پر آچکے ہیں انھوں نے حمد و نعت، آزاد نظم، پابند نظم اور غزل کے حوالے سے ایک وقیع نوعیت کا کام کیا شاعرہ موصوفہ کا بنیادی تعلق کراچی سے تھا اور کافی عرصہ لندن میں مقیم رہیں اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں بھرپور فعالیت سے حصہ لیا ان کے حوالے سے ناقدانہ خیال آرائی کرنے والوں میں بہت سے معروف و غیر معروف ناقدانِ فن شامل ہیں تاہم مشفق خواجہ کی مختصر مگر جامع رائے ان کی تخلیقانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے جو حسبِ ذیل ہے۔

”طلعت اشارت طویل عرصے سے شعر کہہ رہی ہیں اس سے قبل ان کی غزلوں اور نظموں کا ایک مجموعہ ”اشارت“ بھی شائع ہو چکا ہے انھیں شعر گوئی کا سلیقہ ہے وہ اپنے جذبے، احساس اور فکر کو شعر میں ڈھالنے کا ہنر جانتی ہیں جو پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتا ہے۔“

طلعت اشارت کے تیسرے شعری مجموعہ ”منجمد لمحے“ مطبوعہ 2012ء جو ان کی وفات کے تقریباً ایک سال بعد شائع ہوا کی غزلیات کے منتخب اشعار شذرہ ھذا میں شامل تجزیہ ہیں۔

غزل ان کی محبوب ترین صنفِ سخن ہے جس سے والہانہ پن کا اظہار ان کے کلام کے مطالعہ سے بخوبی ہوتا ہے وہ غزل کے فکری و فنی اسرار و رموز سے آشنا ہیں ان کی غزل فکر و شعور اور احساسات سے معمور و منور ہے اگر فکری تناظر سے دیکھا جائے تو ان کی شاعری عمومیت سے ماورا ہے ایک مخصوص نوع کی سنجیدگی، تقدس اور ذوق و انہماک نمایاں ہے۔

دل میں اک تیر نہاں ہو تو غزل ہوتی ہے
سر میں سودائے بیاں ہو تو غزل ہوتی ہے
زیست کی تیرہ شبی میں کوئی محبوب نظر
شمعِ ہستی میں نہاں ہو تو غزل ہوتی ہے
ہو اگر سجدہ گہہ اہلِ وفا کعبۂ شوق
اور نمازِ دل و جاں ہو تو غزل ہوتی ہے
تجزیہ کیجیے کتنا بھی غمِ جاناں کا؟

شوق کو ذوق بیاں ہو تو غزل ہوتی ہے

طلعتؔ کے ہاں حیات و ممات کے حوالے سے ایک شعوری عمل کارفرما ہے جس میں کئی زاویے ہیں اور ہر زاویہ ان کی فکری بالیدگی پر دلالت کرتا ہے جس سے زیست کے بسیط تجربات و مشاہدات کی غمازی ہوتی ہے سوچ کا ایک اختصاصی رنگ ہے جو بین الیان رنگ آمیزی کر رہا ہے عالمِ برزخ کے معاملات ہوں یا زندگی کے پیچ و خم سبھی عوامل ان کے ہاں رقم ہیں۔

جو مر چکے ہیں وہ سوئے ہیں کس سکوں کے ساتھ؟
یہ کشمکش یہ گھٹن زندگی کا صدقہ ہے

ان کا سخن محض فلسفیانہ موشگافیوں سے عبارت نہیں ہے۔ جہاں حقیقت کا حال ہے وہاں مجاز کا ملال بھی ہے شکوہ سنجی کے نقوش تیکھے اور چوکھے ہیں جن کی بدولت تلخ عصری رویوں کی بازگشت بھی سنی جا سکتی ہے بلکہ ایک مکمل عصری مزاج سمٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اب دمِ عیسیٰ میں اعجازِ مسیحائی نہیں
آپ کی نظروں میں انداز پذیرائی نہیں
جو مری رگ رگ میں بہتا ہے لہو کے ساتھ ساتھ
اس کی چشمِ کور میں رمزِ شناسائی نہیں

ان کے فحوائے کلام میں جاذبیت آمیز ترکیبات کی ایک چاشنی موجود ہے جو ان کے ذوقِ لطیف کا پتا دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کلاسیکی مزاج سے ہم آہنگ ہے روایت سے ان کا رشتہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہے مگر جدتوں سے اعراض کی صورت بھی نظر نہیں آتی گویا روایت و جدت کی ایک امتزاجی کیفیت پائی جاتی ہے۔

طلعتؔ اشارت کے فکری کینوس میں عصری بے حسی کا موضوع بھی اپنے کروفر سے کارگر نظر آتا ہے جو عصرِ حاضر کے رویوں کی ایک مکمل دستاویز کی حیثیت کا حامل ہے طربیہ تاثرات کا فقدان ہے اور حزنیہ افکار کا بھرپور سامان ہے ان کے تخیلات قاری کی زبانی معلوم ہوتے ہیں انھوں نے اظہار کا بالواسطہ طریقہ اختیار کیا ہے جسے شاذ ہی لائقِ ہدف کیا جا سکتا ہے۔

حبس اتنا ہے کہ سانسوں کو ہوا کہتے ہیں لوگ

لو اگر چلنے لگے بادِ صبا کہتے ہیں لوگ
دم بدم بڑھتی ہوئی تنہائیوں کے دور میں
آرزوئے بزمِ ہستی کو خطا کہتے ہیں لوگ
جب گراں ہونے لگے تارِ نفس احساس پہ
زندگی کو عشق جینے کو وفا کہتے ہیں لوگ

ان کے بیان میں تمثیلات کا حسین انداز ان کی شاعری کی جان بنا ہوا ہے جس کے باعث ان کے سخن میں شدتِ احساس اور زورِ بیان در آیا ہے انھوں نے زیست کے ادراکاتی زاویوں کو بھی انتہائی خوب صورتی سے آشکار کیا ہے۔

وہ بھی تقدیر کے آسیب کا مارا ہوگا
جس نے غمِ ہستی کو نکھارا ہوگا

طلعت کے احساسات کا ایک معجزاتی پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کہیں کہیں عصری بے حسی سے شاکی و نالاں نظر نہیں آتی بلکہ انھیں اس سے ایک بھرپور تشفی ملتی ہے اور ان کا عزم و حوصلہ فزوں تر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو ان کی فکر کا ایک تجزیاتی اور نیا موڑ ہے جو لائقِ اعتنا ہے۔

جسے بھی دیکھیے تنہا دکھائی دیتا ہے
تجھی تو کر نہ سکی زیست اشک بار مجھے

اگر فنی حوالے سے دیکھا جائے تو انھوں نے زیادہ تر مفرد و محذوف بحور میں مشاطگیٔ سخن کی ہے ان کے اسلوب کی شائستگی و شستگی خود میں ایک اپنائیت کا جہاں سموئے ہوئے ہے کہیں کہیں دقیقہ سنجی کے مظاہر بھی انتہائی خوب صورتی سے نمودار ہوئے ہیں جن کی بدولت ان کا سخن ثقیل و گنجلک اور بوجھل محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک قرینہ سازی اور نادرہ کاری کا احساس چھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

مذکورہ استشہادات و استخراجات سے یہ امر اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ طلعت اشارت کے کلام کا ادراکاتی کینوس بہت وسیع و عریض ہے جس میں ایک آفاقی رنگ پنہاں ہے اگر حیاتِ ناپائیدار انھیں کچھ مزید مہلت دے جاتی تو ان کے شعری زاویے کچھ مزید نکھر کر سامنے آتے۔

* * *

# غزل

طلعت اشارت، کراچی

دل داریوں کی کہنہ روایت نہیں رہی
آنکھوں میں آپ کی بھی مروت نہیں رہی

اتنے فریب کھائے ہیں احباب کے طفیل
اب ہم کو دشمنوں کی ضرورت نہیں رہی

دم بھر رہا ہے جس کو بھی دیکھیں خلوص کا
دل کو مگر خلوص کی عادت نہیں رہی

ہاں آسماں پہ اب بھی شفق پھولتی تو ہے
انسان کو نظارے کی فرصت نہیں رہی

ہم بھی وہی ہیں دل بھی وہی ، درد بھی وہی
وہ عشقِ باصفا کی روایت نہیں رہی

گو ڈھل رہے ہیں آج بھی الفاظ میں خیال
حرفِ جنوں میں مستی و حیرت نہیں رہی

رنگِ جہاں یہی ہے تو پھر ٹھیک ہی تو ہے
ہم کو بھی ان سے کوئی شکایت نہیں رہی

یوں تو رواج و رسم ہمیں بھی عزیز ہیں
طلعتؔ نباہ کرنے کی ہمت نہیں رہی

# غزل

## طلعتؔ اشارت، کراچی

نہ گر شہرِ وفا کی خاک راس آئی تو کیا ہوگا؟
نہ کام آئی ہماری آبلہ پائی تو کیا ہوگا؟

جو ہم کو انتہائے حسن نہ بھائی تو کیا ہوگا؟
جنوں کو تربیت غم کی نہ راس آئی تو کیا ہوگا؟

جو کی اس دید نے دل کی پذیرائی تو کیا ہوگا؟

زمیں نے آسماں پر اوس برسائی تو کیا ہوگا؟

ہمارا بھی ارادہ مصلحت کوشی کا ہے لوگو
دلِ ناداں نے لیکن آگ بھڑکائی تو کیا ہوگا؟

چلے تو جائیں اس کوچے میں رکھ کر جاں ہتھیلی پر
تمنائے سر و ساماں ابھر آئی تو کیا ہوگا؟

چلو ہم اُن کی بیگانہ روی کی لاج رکھ لیں گے
جو ہر ذرے میں وہ صورت ابھر آئی تو کیا ہوگا؟

جہاں پر ظالم و مظلوم میں تفریق مشکل ہو
کسی نے عدل کی زنجیر کھڑکائی تو کیا ہوگا؟

# عابدہ نکہت کا پندارِ ذات

جہاں شعر میں داخلیت اور خارجیت فکری اعتبار سے دو مختلف پیرایۂ اظہار ہیں لیکن باہم مربوط ہیں داخلی عوامل خارجیت کی نمو پذیری میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں دیگر موضوعاتی افکار کے علاوہ شاعر کا احساسِ ذات اور پندارِ ذات بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے جو مختلف شعرا میں کم و بیش پایا جاتا ہے آج ہم عابدہ نکہت کی شاعری کی نسبت سے اپنے تاثرات و تجزیات زیب

قرطاس کر رہے ہیں جو کراچی میں سکونت پذیر ہیں فکری اعتبار سے پندارِ ذات اُن کا خصوصی حوالہ ہے اس وقت اُن کا اولین مجموعۂ کلام ”برستے بادل“ مطبوعہ جنوری 2008ء ہمارے پیشِ نظر ہے جس کی غزلیات کے منتخب اشعار مذکورہ موضوع کے تناظر میں شاملِ تجزیہ ہیں۔

عابدہ نکہت کے سخن میں احساسِ ذات اور پندارِ ذات کے شواہد تعلیاتی تاثر کے ساتھ کارفرما ہیں جس سے اُن کے ادراکِ ذات کا پہلو اُجاگر ہوتا ہے اُن کی فکر میں ایک عصری مسابقت کی فضا بھی پائی جاتی ہے۔

ہم جو پتھر تراشیں تو ہیرا بنے
ان کے دامن میں لعل و گہر ہو تو ہو

عابدہ نکہت کی فکر کا نقطۂ کمال یہ ہے کہ اُن کے ہاں ہر نوع کے تجربات کی آموزش کا سامان موجود ہے جو اُن کی جہاں فہمی کی دلیل بھی ہے لیکن حزن و ملال کا تاثر اختتامی اہمیت کا حامل ہے۔

چنے پھول بھی ملے خار بھی ہوئے تجربے بھی بہت مگر
اسی راہ میں کہیں کھو گئی ہے مرے سکوں کی اساس بھی

فطری طور پر ہر انسان کو اپنے ماضی کی حسین یادیں عزیز تر ہوتی ہیں بچپن اس لیے زندگی کا محبوب ترین دور ہوتا ہے کیونکہ انسان ہر طرح کی ذمے داریوں سے آزاد ہوتا ہے اور کھیل کود کی دنیا میں شاد ہوتا ہے جوں جوں عمر بڑھتی ہے حیات کی تلخ سنجیدگی انسان کو دبوچنا شروع کر دیتی ہے اور انسان مجبور و بے بس ہو کر رہ جاتا ہے نکہت عابدی نے اپنے بچپن کی الہڑ یادوں کو یوں شعر کی زباں بخشی ہے۔

وہ احساسِ رفتہ مجھے یاد آیا
ہوا جس کو گزرے ہوئے اک زمانہ
خیالوں میں بچپن کے رنگین سپنے
نگاہوں میں سرو و سمن کا خزانہ

شاعری ایک موزوں گفتگو اور خود کلامی کا نام بھی ہے۔ لیکن جب معاملہ پندارِ ذات کا ہو تو پھر ذات سے تکلم فزوں تر ہو جاتا ہے جس میں ماضی و حال اور مستقبل کی ایک فکری تثلیث ہوتی

ہے جس میں ہر عہد سے متعلق خیالات پائے جاتے ہیں:

وہ چند لمحے کہ جو زندگی کا حاصل تھے
کبھی تو اس سے بیگانہ ہوگئی ہوگی

متنوع موضوعات کا اہتمام عابدہ نکہت کے ہاں فلسفۂ سادگی و سہولت کے ساتھ موجود ہے جو تاثر کی فزوں تر دولت سے مالا مال ہے زیست کے حوالے سے حزنیہ و طربیہ ہر طرح کے خیالات ملتے ہیں۔

عابدہ نکہت کا مذکورہ مجموعۂ کلام نقشِ اول کا درجہ رکھتا ہے دیدہ باید کہ مستقبل میں ان کا کلام کیا کروٹ لیتا ہے بہر حال ان کے فکر و فن کو فزوں تر بالیدگی درکار ہے۔

○

# غزل

عابدہ نکہت، کراچی

ذہن پہ کچھ یادوں کا بوجھ
پلکوں پہ خوابوں کا بوجھ

شانۂ صبحِ گیتی پہ
سہمی ہوئی راتوں کا بوجھ

دل کی قیمت کچھ بھی نہیں
اور اس پر لاکھوں کا بوجھ

اور کوئی احسان کرو
کم ہے اگر باتوں کا بوجھ

نکہتؔ کس کو کیا سمجھائیں؟
بار ہے اب سانسوں کا بوجھ

# غزل

عابدہ نکہتؔ، کراچی

پھر وہی کشمکشِ عام کوئی کام کریں
پھر وہی تلخیٔ ایام کوئی کام کریں

ہے وہی اصل چھلک جائے جو پیمانے سے
کچھ نہیں دُردِ تہِ جام کوئی کام کریں

شکوۂ دہر کی فرصت نہ رہے گی باقی
ہے نئی راہ بہر گام کوئی کام کریں

ہاں ابھی منزلِ موہوم کو اُٹھے ہیں قدم
دور ہو جائے گا ابہام کوئی کام کریں

تبسم سی فضا چاندنی راتوں سا سکوں
کتنی پر کیف ہے یہ شام کوئی کام کریں

ایسے افسانے مکمل نہیں ہوتے نکہتؔ
جن کا آغاز ہو انجام کوئی کام کریں

# عظمیٰ صدیقی رجائی احساسات کے آئینے میں

رجا قسیمِ فکر کی عالم گیر اور معتبر حقیقت ہے جس سے زندگی کے چشمے پھوٹتے ہیں زیست کی امنگ اُجاگر ہوتی ہے حیات کو نئی تاب و توانائی ملتی ہے بنی نوع انسان کی دنیا و عقبیٰ میں کامیابی کے لیے رجائی اندازِ فکر کو کلیدی حیثیت حاصل ہے دنیائے ادب میں حزن و ملال کی نسبت طرب و رجا

کے شواہد بہت ہی کم میسر آتے ہیں جن اصحاب حقیقت کے ہاں اس کے مظاہر موجود ہیں وہ لائق اعتنا اور قابلِ قدر ہیں شذرہ ھٰذا میں ہم اسی نوع کے طرزِ احساس کی حامل شاعرہ مکینِ کراچی عظمیٰ صدیقی کے حوالے سے رقم طراز ہیں جن کا فکری کینوس متنوع و متلون ہے دیگر موضوعات کے پہلو بہ پہلو رجائی امکانات بھی نمو پاشیاں کر رہے ہیں اس وقت اُن کا مجموعۂ کلام ”آؤ کچھ خواب چنیں“ مطبوعہ 2011ء ہمارے روبرو ہے جس میں غزلیات کا تناسب سب سے زیادہ ہے کچھ پابند و آزاد نظمیں بھی شامل ہیں کتاب مذکور کی منتخب غزلیات کے اشعارِ منتخبہ متذکرہ موضوع کی نسبت سے بطور استشہادات برائے تصریحات شاملِ مضمون کرتے ہیں۔

عظمیٰ صدیقی کی شاعری کے حوالے سے امجد اسلام امجد کے تاثرات حسبِ ذیل ہیں۔

”غزل کہنا جس قدر آسان ہے اچھی غزل کہنا اتنا ہی مشکل ہے عظمیٰ صدیقی کی شاعری میں پختگی اور معصومیت ساتھ ساتھ چلتے دکھائی دیتے ہیں مجھے یقین ہے کہ اگر وہ کلاسیکی غزل کا لگ کر مطالعہ کریں تو اُن کی شاعری میں موجود امکانات کو مزید فروغ ملے گا۔“

عظمیٰ شعر و ادب کی مختلف اصناف کو برتنے کا ہنر جانتی ہیں جن کی تخلیقات میں عصری بے حسی بھی محسوس کی جا سکتی ہے عظمیٰ صدیقی دونوں اصنافِ سخن غزل اور نظم میں بڑی روانی اور سلیس زبان میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کا ملکہ رکھتی ہیں۔

ان کے سوانحی کوائف کی جھلک یوں ہے انھوں نے کراچی میں جنم لیا جامعہ کراچی سے انھوں نے سیاسیات اور اردو ادبیات میں پوسٹ گریجویٹ کیا۔ 1994ء میں پبلک سروس کمیشن کے ذریعے بہ حیثیت ماہرِ مضمون آغازِ تدریس کیا۔ 1995ء میں جرمنی آ گئیں وہاں جرمن زبان سیکھنے کے بعد سماجی، فلاحی اور امدادی سرگرمیوں میں مصروف رہیں۔ تادمِ تحریر لندن میں مقیم ہیں اور تدریسی فرائض سر انجام دے رہی ہیں تخلیقِ شعر کے علاوہ افسانہ نگاری اور کالم نویسی سے بھی وابستہ ہیں۔

اُن کے ہاں ایک نئے عزم و حوصلہ کی داستان ملتی ہے جس میں امنگیں جواں نظر آتی ہیں ایک بھرپور رسِ حیات ہے جو پے سخن جلوہ افروزی کر رہا ہے جہاں عالمِ مجاز رجا کی ردا اوڑھے ہوئے ہے جس سے ایک خوشگوار اور لطیف احساس نمو پاشیاں کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اک چراغ اور محبت کا جلایا جائے
روشنی بن کے تری بزم میں آیا جائے

عظمیٰ صدیقی کا اندازِ فکر رجائی آہنگ سے مرصع ہے جس میں بھرپور نوعیت کی رومان آمیزی بھی ہے جو ان کی شگفتگیِ احساس کا پتا دیتی ہے۔

دور جو شام کا ستارا ہے
وہ محبت کا استعارا ہے

وہ نالہ وشیون سے اپنے شعری ادراکات کو ماورا رکھتی ہیں اس لیے ان کے گنجِ افکار میں طنز وتنقید کے نوکیلے نشتر نہیں ہیں وہ حیات وکائنات کو خوب صورت زاویوں سے دیکھتی اور سوچتی ہیں۔ اپنی اقدار اور مادرِ گیتی سے انھیں بے انت محبت ہے۔

اپنے وطن میں امن وسکوں ہے گھر گھر میں خوش حالی ہے
ہم وطنو یہ خواب سہانا ہم نے اکثر دیکھا ہے

عظمیٰ کے سخن میں ترکیبات واستعارات کی دلکشی بھی ایک خاص خصوصیت رکھتی ہے اس سلسلے میں وہ مظاہرِ فطرت کو انتہائی خوش اسلوبی سے بروئے کار لاتی ہیں۔

بزمِ احساس سجے گی مری جس دم عظمیٰ
دشتِ امکاں میں کئی چاند ستارے ہوں گے

ان کے تخیلات میں حقیقی ومجازی عوامل پہلو بہ پہلو مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں اس لیے ان کے افکار متوازن صورت اختیار کیے ہوئے ہیں جن میں احساسِ سپاس گزاری اور وفا کی پاسداری بھی ہے۔

کبھی کبھی تو خزاں میں بھی پھول کھلتے ہیں
مگر یہ کام تو کرتا ہے میرا رب تنہا
میرے لیے تو مجسم دعا تھا اس کا وجود
کہ اس کے ہوتے ہوئے میں ہوئی تھی کب تنہا؟

عظمیٰ کے ذہنی کینوس میں شکوہ وشکایت کی حکایت و روایت معدوم نظر آتی ہے بلکہ احساسِ سپاس گزاری جلوہ ریزیاں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے یہ امر بھی ان کی فکر کا ایک رجائی زاویہ

ہے اس لیے اُن کے ہاں تلخ عصری رویے ناپید ہیں جس کے علی الرغم فرحت وانبساط کی کیفیات قاری کے لیے آغوش کشا نظر آتی ہیں اُن کے سخن کا مطالعہ جہاں ادراکاتِ حیات سے مرصّع ہے وہاں آموزشِ ہستی کا ساماں بھی ہے ایک کیف ونشاط کی فضا ہے جو مضبوط حصار کا درجہ رکھتی ہے اُن کے کلام تمثیلاتی انداز اُن کے بیان کی جان محسوس ہوتا ہے جو فطری انداز کا حامل ہے۔

آپ کا سایۂ لطف و کرم ہے کچھ ایسا
کہ جیسے سر پہ کوئی سائبان لگتا ہے

عظمیٰ صدیقی کے شعری رویّوں میں زیست سے محبت، اس کی رونق ورعنائی اور چمک دمک ایک درسِ زریں کی حیثیت رکھتی ہے ان کے احساسات لائقِ افتخار ہیں وہ ادب برائے زندگی کے نظریہ سے وابستہ ہیں جو زیادہ روح افزا اور جاں دار وقیع بھی ہے جس سے ان کی سخن گستری کا فطری انداز نمایاں ہوا ہے اور ایک آمد کی فضا معلوم ہوتی ہے کسی نوع کے تصنع کا گماں نہیں گزرتا۔

عظمیٰ حرفِ سخن کے مرہم سے
گھاؤ ہم زندگی کے بھرتے ہیں

عظمیٰ کی سخن سنجی کا نقطۂ تحیر یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں اُن کا حزن وملال یاسیت آمیز نہیں ہے بلکہ تمہت بیز ہے جس میں لطافت، چاشنی اور جاذبیت کے وسیع تر امکانات مضمر ہیں اس نوع کی تمثیلات شعری ادب میں شاذ ہی کہیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

اسی امید پہ زندہ ہوں میں شام و سحر
کہ مجھ میں خواب کی خواہش تو مر نہیں سکتی
شکست کھا کے بھی گرتا نہیں مرا معیار
اصول سے میں بغاوت بھی کر نہیں سکتی

فطری طرزِ کلام کا اعجاز وکمال یہ ہے کہ اس کا اسلوب ترکیبات وتشبیہات وتمثیلات اور مصرعوں کی نشست وبرخاست تیز جملہ معاملات اور فطرت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں اور یہی وصفِ سخن عظمیٰ کا خاصا ہے۔

آسمانوں پہ جتنے تارے ہیں

سب تمنا کے استعارے ہیں

عظمیٰ صدیقی کے فحوائے بیاں میں وسیع تر رجائی امکانات ہیں جو اُن کے کلام کی معتبر و مستقل نوید ثابت ہو سکتے ہیں تاہم ہنوز انھیں فزوں تر فکری وفنی بالیدگی مطلوب ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے ہاں شدتِ احساس اور زورِ بیان انتہائی معصومیت کا حامل ہے جسے بالیدگی درکار ہے عروضی اعتبار سے انھوں نے زیادہ تر محذوف و مرکب بحور میں مشاقیٔ سخن کی ہے اسلوب میں ترفع کا فقدان ہے بہر حال اُن کا ارتقائی سفر حوصلہ افزا ہے جس کے لیے تسلسل مندوب و مستحسن ہے۔

◆

# غزل

## عظمیٰ صدیقی، کراچی

تمام رات لبِ بام جاگتے ہیں چراغ
ہوا کے دوش پہ کب سے رکھے ہوئے ہیں چراغ

روش روش پہ ستارے بچھا دیے ہم نے
تمھاری راہ میں کتنے جلا رہے ہیں چراغ؟

ہماری آنکھوں کی بیداریوں میں پڑھ لیا

دعا کسی کے لیے جل کے مانگتے ہیں چراغ

وہ انتظار کی بیداریوں سے ہیں واقف
شبِ فراق کے ہر دکھ کو جانتے ہیں چراغ

کہیں کہیں تو اندھیرے ہیں اس قدر گہرے
بجائے رات کے دن میں بھی جل رہے ہیں چراغ

اندھیری رات میں روشن کیے مگر عظمٰی
ہوا کے خوف سے رہ رہ کے کانپتے ہیں چراغ

# غزل

**عظمٰی صدیقی، کراچی**

جب غزل عظمٰی ہماری چاندنی بکھرائے گی
پنکھڑی باغِ سخن میں اک نئی مسکائے گی

اک کرن نورِ سخن کی دہر میں لہرائے گی
بزم میں حسنِ غزل کی چاندنی چھا جائے گی

تھام کر خوشبو کا دامن دیکھو چلتی ہے ہوا

اب دریچہ ہر نظر کا یہ فضا مہکائے گی

ہے لباسِ نور میں سمٹا ہوا حسنِ خیال
روشنی تصویر بن کر آئینوں میں آئے گی

مدعا کچھ بھی نہیں ہے بس دعائے دل ہے یہ
یہ تری طرزِ ادا ہے جو مجھے کچھ بھائے گی

جس کو کہتے ہیں محبت وہ بھی ہے کیا خوب شے
دیکھیے کیا کیا فسانے زندگی دہرائے گی؟

# غزلؔ انصاری کے فکری زاویّے

فطری طور پر ہر شاعر اور شاعرہ فکری اعتبار سے اپنی شاعری کا آغاز جذبہ رومان یا محبت سے کرتا ہے گویا جنس الفت فکری ارتقا کے قصر کی خشتِ اول ہے جس پر فکری بنیاد استوار ہوتی ہے بعد ازیں دیگر موضوعات بھی حیطۂ ادراک میں در آتے ہیں شاعرات میں یہ جذبہ وفور سے پایا جاتا ہے جسے داخلی اظہار کا نام بھی دیا جاتا ہے آج ہم کراچی سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی شاعرہ کے حوالے سے رقم طراز ہیں جنھوں نے اپنی سخن سنجی کا آغاز انتہائی صغیر سنی سے کیا جس کے کلام میں

جذبوں کی کسک اور احساس کی آنچ شدید تر ہے جو قاری کو متوجہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے ان کے ہاں اگرچہ عشق مجازی کے حوالے بہ کثرت پائے جاتے ہیں تاہم زیست کے دیگر زاویے بھی جلوہ ریزیاں کر رہے ہیں۔

غزل انصاری کے آبا و اجداد کا مولد و مسکن سہارن پور بھارت ہے جو قیامِ پاکستان کے بعد کراچی میں مقیم ہوئے غزل انصاری نے بھی کراچی میں ہی جنم کیا ابتدائی و اعلیٰ تعلیمی مدارج بھی یہیں پہ طے کیے۔ ڈاکٹر این ایچ انصاری سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ 1993ء سے موصوفہ اپنے شوہرِ مالوف کے ہمراہ انگلینڈ کے شہر ڈیوزبری میں سکونت پذیر ہیں۔

غزل انصاری کلاسیکی غزل کا عمیق مطالعہ رکھتی ہیں اس لیے اُن کا کلام بھی روایت کے رچاؤ کا حامل ہے ان کا اولین شعری مجموعہ ''ادھورے خواب'' 2004ء میں منصۂ شہود پر آیا جس میں غزل پابند نظم، آزاد نظم اور قطعات و فردیات شامل ہیں ان کی چند غزلیات کے منتخب اشعار بطورِ استشہادات چند استخراجات و تصریحات و تجزیات شاملِ شذرہ کرتے ہیں۔

اُن کے فکری کینوس میں ایک قناعت و استغنا کی خصوصیت پائی جاتی ہے جو اُن کی متحمل شخصیت کی علامت ہے حرص و ہوس اور لوبھ جیسے سماجی خبائث سے ماورا ہیں زیست کا جو روپ اُنھیں مشیت سے ودیعت ہوا ہے وہ اس پر قانع و شاکر ہیں۔

دل جسے چاہے وہ مل جائے ضروری تو نہیں
دل کا ہر زخم ہی سل جائے ضروری تو نہیں
اُس کا خوابوں میں لگا رہتا ہے آنا جانا
وہ حقیقت میں بھی مل جائے ضروری تو نہیں

غزل کا سخن اپنے عہد کی ترجمانی سے مملو ہے جو عصری مزاج کی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس میں عصری بے حسی سماجی رویئے اور نالہ و شیون کی مکمل کتھا موجود ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد سے بھرپور تاثر قبول کیا ہے اور اسے پُرزور انداز میں متاثر کرنے میں بھی کامیاب ہوئی ہیں۔

کس سے فریاد کریں حالِ وفا کس سے کہیں؟

کون سنتا ہے یہاں دل کی کتھا کس سے کہیں؟

اُن کے کلام کے استفہامیہ اشارات کی بدولت اُن کے شدتِ احساس اور زورِ بیاں میں بدرجہ اتم اضافہ ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کا اسلوب بے جان اور سپاٹ نہیں ہو پاتا اور قاری کو سرسری گزر جانے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔

غزل انصاری کے نزدیک حزن و ملال کو زیست کی اساسی حیثیت حاصل ہے اس لیے حزنیہ مزاج رکھنے کے باوجود بھی وہ زندگی کی لاحاصلی کا شکار نہیں وہ غم کو حیات کی اعلیٰ اقدار کا پاسدار و ضامن سمجھتی ہیں اور اسے گوہرِ ہستی گردانتی ہیں اُن کا حزن قاری کے لیے وجۂ یاسیت نہیں بلکہ باعثِ نشاط و فرحت ہے یہ امر اُن کی حزنیہ شعری طبع کا ایک رجائی اور طربیہ پہلو ہے۔

غم کی بھٹی میں تپے اور بن گئے کندن غزل
کیوں یہ سودا کر لیا ہم سے کبھی مت پوچھنا؟

غزل انصاری کی تخلیقی طبع متنوع نوعیت کی ہے جس میں ایک بوقلمونی اور رنگا رنگی ہے فکر کے مختلف زاویے ہیں جو قاری کے لیے آغوش کشا نظر آتے ہیں کبھی کبھی اُن کے ہاں غم کی آنچ شدید تر ہو جاتی ہے جس کے باعث شکوہ و شکایت کا پہلو اُجاگر ہو جاتا ہے اور نا اُمیدی بامِ عروج پر پہنچتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

اب زندگی کا کوئی سہارا نہیں رہا
سب غیر ہیں کوئی بھی ہمارا نہیں رہا

غزل نے پُر احساس رومان نگاری بھی کی ہے مجازی حوالے تندرست و توانا صورت میں جلوہ ریزیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں ایک بے خودی و سرمستی کی فضا ہے جو پڑھنے والے کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے تصورِ جاناں کے شواہد ایک محویت اور خودسپردگی کے عالم میں کارفرما ہیں۔

**بہ قولِ راقم الحروف:**

مجھے زمانے کی کیا خبر ہو؟
میں گم ترے انتظار میں ہوں

اس موضوع کو شاعرہ موصوفہ نے کچھ اس انداز میں برپایا ہے:

میں اس کے خیالوں میں کھوئی رہی
مجھے کیا پتا کب کٹے روز و شب؟

ان کے شعری کینوس میں سماجی منظر نامہ بھی اپنی حقیقی صورت میں جلوہ گر نظر آتا ہے وہ دنیا کو مکافاتِ عمل سمجھتی ہیں اور خود تنقیدی کے کٹھن اور جاں گداز عمل سے گزرتی ہیں فکر کا یہ جاں گسل انداز ان کی شخصی صداقت کی عمدہ تمثیل ہے۔

رسوائیاں ہیں اپنے ہی اعمال سے نصیب
کردار کیا ہے اپنا تصور میں لائیے؟

غزل انصاری نے زیادہ تر مفرد و محذوف بحور میں طبع آزمائی کی ہے اور عروضی تقاضے بھی بطریقِ احسن نبھائے ہیں ان کا اسلوب شستہ اور رواں دواں ہے ان کے احساسات کو رفعتِ تخیل اور مزید لسانی و فنی ادراکات مطلوب ہیں جوں جوں ان کا ریاضِ شعر فزوں تر ہوگا یہ زینے بھی با آسانی طے پا جائیں گے۔

◆

# غزل

**غزل انصاری، کراچی**

نہ فکر کرنا ہمارے دل کی نہ اس جنوں کا ملال رکھنا
یہ التجا ہے ہماری تم سے تم اپنے دل کو سنبھال رکھنا

وہ شامِ غم جو گزاری ہم نے کوئی گزارے تو جان پائے
کٹھن ہے کتنا ہے، ہے کیسا مشکل اٹھا کے ماضی میں حال رکھنا

کوئی صحیفہ سمجھ کے رکھا تمھارے خط کو چھپا کے دل میں
مری محبت کو اپنے دل میں ہمیشہ تم لازوال رکھنا

تمھی کو چاہا تمھی کو پوجا تمھی کو دل میں سجا کے رکھا
یہی ہے شیوہ یہی وطیرہ نظر میں تیرا جمال رکھا

اُجالا کرتے تمھارے گھر میں جو بس میں ہوتا غزلؔ تمھارے
دعا ہماری ہے عمر ساری خودی کو تم باکمال رکھنا

# غزل

غزل انصاری، کراچی

بُھلانا ہے بہت مشکل مگر پھر بھی بُھلانا ہے
تری یادوں کو دل سے اب تو ہر صورت مٹانا ہے

بہت رسوائیاں سہہ لیں دلِ برباد کی خاطر
مگر الفت پنپ سکتی نہیں ایسا زمانہ ہے

مرا دامن پکڑ لیتی ہیں وہ معصوم سی یادیں
مرے جیون میں تیری یاد ہی واحد خزانہ ہے

تو آنکھوں میں تو یادوں میں تو ہر دم میرے خوابوں میں
کھلے جب آنکھ تو ہر سو وہی منظر پرانا ہے

ملائے عشق جو رب سے غزل ہے عشق وہ سچا
خدا سے لو لگا لے پھر کہیں کچھ یاد آنا ہے

# فہمیدہ ریاض کی نظم اور غیر روایتی تخیلات

دنیائے شعر بہت گنجان آباد ہے۔ آوازوں کے اس ہجوم میں جہاں آواز کے دب جانے کا قوی امکان ہوتا ہے، وہاں اپنی ایک منفرد پہچان رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ جس کے لیے روایت وجدت کا تعین ضروری ہے اس کے بغیر آپ اپنے فن میں ندرت نہیں پیدا کر سکتے۔ غیر روایتی تخیلات کے لیے ضروری ہے کہ اسلوب میں بھی جدت کے مظاہر موجود ہوں۔ بے جان اور

سپاٹ قسم کا اسلوب نہ ہو۔ فہمیدہ ریاض ایک ایسی شاعرہ ہیں جنہوں نے اپنے افکار کی بدولت دنیائے شعر و سخن میں ایک نمایاں مقام پایا ہے جن کے اسلوب میں غیر روایتی اسلوب اور احساسات شامل ہیں۔ اُردو زبان اپنے اندر لاتعداد فارسی و عربی الفاظ سموئے ہوئے ہے۔ مذہبی تعصبات کے باعث ہندی الفاظ کا چلن عربی و فارسی کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ میڈیا کی ترقی کے باعث لسانی رواداری میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے جس کے باعث ہندی لفظیات کو اُردو میں جگہ دی گئی۔ فہمیدہ ریاض ان معدودے چند ابتدائی لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے اُردو میں ہندی کے اثر کو قبول کیا۔ قبل ازیں فکر تونسوی نے بھی ہندی لفظیات کو انتہائی قرینے سے برتا اور ہندی تہذیب و تمدن کے خدوخال اجاگر کرنے کی بھی کوشش کی اور فہمیدہ ریاض نے اسی سلسلے کو آگے بڑھانے کی سعیِ جمیل کی ہے۔ ان کے ادراکات میں ایک عمیق عمرانی اور تہذیبی شعور ملتا ہے۔ کچھ تلخ شواہد بھی ہیں جو ان کے تجربات و مشاہدات کا حاصل ہیں۔ ان کی شاعری دنیائے سخن کے سنجیدہ قاری کو زیادہ متاثر کرتی ہے کیوں کہ ان کے ہاں نجی اور سطحی الفاظ و جذبات کا فقدان ہے۔ ان کا اسلوب دقیقہ سنجی کا مظہر ہے۔ یہ دقیقہ سنجی لسانی اور فکری دونوں حوالوں سے ہے۔ اس شذرے میں ہم ان کے شعری مجموعہ ''دھوپ'' مطبوعہ 1975ء کی منتخب نظموں کے اقتباسات شامل تجزیہ کرتے ہیں۔

ان کے موضوعات میں جدت و شدت کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ وہ عوامل ہیں جو کسی تخلیق کار کی پذیرائی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کا سخن قلب و فرد پر گہرے نقوش ثبت کرتا ہے۔ ان کے موضوعات میں سماجی بے حسی، عصری کرب اور شدید نوعیت کا احساسِ تنہائی ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنہائی کی اذیت کتنی قیامت خیز ہوتی ہے۔ اگرچہ انہوں نے اسے ذاتی حوالے سے پیش کیا ہے لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ عصرِ حاضر کے انسان کا اجتماعی مسئلہ بھی ہے جس کے اسباب میں مذہبی عوامل شامل ہیں جو نسلی بے راہ روی کو فروغ دیتے ہیں۔ وہ ایک پر آشوب عہد کی نمائندہ ہیں، آشوب زدگیوں کا عکسِ جمیل ان کے کلام میں جابجا جلوہ سامانی کرتا نظر آتا ہے۔ ان کی ایک نظم ''رات تلملاتی ہے'' کا نشاطِ اوّل دیکھتے ہیں ؎

رات تلملاتی ہے

بے بسی کے پنجے میں
ہنستی غصیلی رات
پنکھ پھڑ پھڑاتی ہے
میری کوکھ میں ہر آن
پل رہا ہے سناٹا
اور میری تنہائی
چوستی ہے سینے سے
گرم دودھ کا دھارا

ان کی منظومات میں تسلسل اور ربط وضبط پایا جاتا ہے۔ ان کے خیالات قاری کو اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں جس کے باعث وہ کئی طرح کی دلچسپیوں سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔

ان کا پیرایہ اظہار غیر معمولی اور سوچ غیر روایتی ہے جو اپنے اندر ایک نئی فضا رکھتی ہے۔ ان کے پاس ایک دعوتِ غور و عمل ہے اور تحرک کے اثرات ہویدا ہیں۔ وہ سماج میں محبتیں بکھیرنا چاہتی ہیں، وہ اپنے ہم وطنوں کے لیے جذبۂ الفت سے سرشار ہیں۔ ان کی نظم کے دو مصرعوں میں فکری ربط دوراندیشی کا غماز ہے۔ ان کی نظم ''پتھر کی زبان'' میں ان کے تلخ اور عمیق مشاہدات کی جھلک دیکھتے ہیں نظم کا شمارِ اوّل ملاحظہ کریں ؎

پتھروں پر دمکتا گیلا لہو
جھلملاتا لہو بہہ رہا ہے
میرے بیٹے یہاں دیدہ ور کون ہے؟
جو نظارہ کرے
دامنِ کوہ میں
کیسے چمکے ہیں یاقوت و مرجاں
ہم وطن تو کوئی سننے والا نہیں
پتھروں نے سنیں

کرب کی سسکیاں
آخری ہچکیاں

ان کی نظموں میں احساسِ یگانگت بھرپور نوعیت کا ہے جس کے باعث ان کا شدید نوعیت کا احساسِ خلوت ہے۔ جہاں جسمانی اور روحانی آسودگیاں میسر نہیں ہیں۔ حوالے کے طور پر ہم نے ان کی صرف دو نظمیں شامل کیں اور طولِ بیان سے کام نہیں لیا تاکہ قارئین کی طبعِ نازک کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تاکہ ان کی دلچسپی فہمیدہ ریاض کے فکر و فن سے وابستہ رہے۔ ان کے ہاں ایک احساسِ اپنائیت کے ساتھ ساتھ ایک احساسِ اجنبیت بھی جلوہ افروز ہے جو عصری مزاج کی غمازی کرتا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ فہمیدہ ریاض نے اپنے عہد کو متاثر کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے اور قاری ان کے سخن سے بہت کچھ مستفید ہو سکتا ہے۔

* * *

# گرہستن

فہمیدہ ریاض، کراچی

سنگیت کے دائرے بناتی ہوئی چال
آنگن سے رسوائی کی طرف جاتی ہوئی
اک ہاتھ دھرے کمر کی گولائی میں
چٹکی میں سارا کام نبٹاتی ہوں
گھر کی بیوہار میں سویرے سے لگی

چہرے پہ تھکاوٹ کا کہیں نام نہیں
گدرائے بدن میں ہے جوانی کا تناؤ
پربت بھی کاٹ دے تو کچھ کام نہیں
دوجے کو تاکتی ہے چنچلتا سے
لمبی چوٹی کمر پہ بل کھاتی ہے
ہنستی جاتی ہے چلبلاہٹ سے بھری
ساجن کو جھلک دکھا کے اُکساتی ہے
دیکھو تو سہاگنی کے مکھڑے کی دمک
اپنے پریتم کی آنکھ کا تارا ہے
جیون کھیتی کو سینچتی جائے گی
امرت کی ندی کا رس بھرا دھارا ہے

# ایک کتاب

فہمیدہ ریاض، کراچی

یہ کیسا جگ مگ سونا ہے؟
ان حرفوں میں
ان لفظوں میں
یہ کچا سونا، جس کی ڈلک سے میرے نین دمک اُٹھے
میرے تاریک لہو میں کیسا نڈر اجالا در آیا؟
اور سارے تن میں پھیل گیا
یہ کیسی سچی سانسوں کی گرمی سے کتاب پگھلتی ہے؟

یہ کس دل کی دھڑکن، دھک دھک
میرے دل سے ٹکراتی ہے
میں کان لگا کر سنتی ہوں دروازے پر کیسی دستک؟
اس گھر میں تو اندھیارا تھا
پھر کون جھروکہ کھلتا ہے؟
یہ کہاں سے آئی چندر کرن؟
جس سے روشن سارا آنگن

میرا دل ایسے چونکا ہے
حیرت سے آنکھیں بھر آئیں
یہ آنسو پیار کا آنسو ہے
یہ آنسو اجلا آنسو ہے
اس آنسو میں تو ہنستا ہے
وہ کچا سونا، جس کی ڈلک سے میرے نین دمک اٹھے

# کشور ناہید کے شعری رجحانات

شاعری لاتعداد رجحانات و میلانات سے عبارت ہے کسی بھی معتبر شاعر کے ہاں اس کے بے شمار فکری زاویے مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں جس سخن داں کے مشاہدات و تجربات عمیق ہوں گے اس کے افکار بھی اس قدر وسیع و بسیط ہوں گے عمومی مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر شعراء و شاعرات کے

رجحانات عمومی موضوعات کے گرد گھومتے رہتے ہیں نسائی شعری ادب میں معدودے چند شاعرات ایسی ہیں جن کے ہاں فکری رجحانات کی بہتات ہے انہی معتبر ہستیوں میں ایک نام کشور ناہید کا بھی ہے جن کا کلام فکری وفنی پختگی کا غماز ہے زبان وبیان کا معیار اعلیٰ وارفع ہے موضوعات میں وسعت اور تنوع ہے ان کا تعلق دبستانِ لاہور سے ہے شذرہ ھٰذا میں ہم ان کے شعری مجموعہ ''لب گویا'' مطبوعہ 1991ء کے خمس اول کے منتخب غزلیہ اشعار کے رجحانات کو زیر بحث لاتے ہیں۔

خلوص ومروت کے فقدان کا مسئلہ ہر عہد میں درپیش رہا ہے اور ہر دور کے شعری ادب میں بھرپور انداز میں بیان ہوا ہے شومیٔ قسمت سے یہ المیہ گھمبیر اور ہمہ گیر ہے تاریخ کے ہر حصے میں اسکی بازگشت سنائی دیتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہماری سماجی اور اخلاقی اقدار میکانزم کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں جن پر مادی دور کا انسان قابو پانے سے قاصر ہے اسی حوالے سے ان کے ہاں نالہ وشیون کے خطیر وپہلو ملتے ہیں کبھی عمومی تجربے کی صورت میں تو کبھی مشیت سے شکوہ وشکایت کے انداز میں ہیں اس لیے ان کی شاعری حرفِ شکایت کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں تنقیدی رویے وفور سے ملتے ہیں ان کی غزل کے دو اشعار اسی پس منظر میں لائق توجہ ہیں

ـــ

نہ کوئی ربط بجز خامشی و نفرت کے
ملیں گے اب تو خلاصے یہی محبت کے
زمامِ کارِ جہاں کس کے ہاتھ ہے یا رب؟
بدل گئے ہیں تقاضے بھی آدمیت کے

ان کا طرزِ اظہار غیر معمولی اور غیر روایتی نوعیت کا ہے نادرالنظیر ترکیبات وتشبیہات کا ایک جہاں آباد ہے ان کی تمثیلات قرینہ کاری کا مظہر ہیں افکار رفعتوں کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں فکری وفنی اور لسانی بالیدگی کے مظاہر آغوش کشا نظر آتے ہیں ان کے داخلی احساسات خارجی اظہار کی راہیں ہموار کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اموزگاری کے شواہد کا انبار

ہے جو جا بجا کارگر دکھائی دیتے ہیں کہیں کہیں بین السطور حیرت و استعجاب کی کیفیات جلوہ ریز ہو رہی ہیں ان کی ایک غزل کے چند اشعار ودیعت ہیں ؎

آنکھوں کے آئینوں کا تو پانی اتر گیا
اب جسم چوب خشک ہے یہ سانحہ بھی دیکھ
ہوتی ہے زندگی کی حرارت رگوں میں سرد
سوکھے ہوئے بدن پہ چڑا کسا بھی دیکھ
بے تابیوں کو سینے کے اندر سمیٹ لے
فتنے کو اپنی حد سے مسلسل بڑھا بھی دیکھ
ہر ذرہ عبرتوں کے سمندر کی شکل ہے
صحرا نورد شوق کبھی نقش پا بھی دیکھ

ان کے تخیلات میں داخلی اظہار کے وسیع تر شواہد ملتے ہیں اور وہ داخلیت میں ید طولیٰ رکھتی ہیں ان کی شعری تمثیلات انتہا درجے کی خوبصورت اور حد کمال کو چھوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں عصری رویوں کی عکاسی بھی ان کے ہاں قابل دید ہے ان کی ایک غزل کے دو اشعار زیب قرطاس ہیں ؎

آنکھوں میں سوئی خواہشیں جاگیں تو جسم بھی
ساکت سمندروں پہ کھلا بادباں لگا
وہ شخص جس کی آنکھ بے رنگ بے طلب
پہلے پہل ملا تو بہت مہرباں لگا

کشور ناہید کے شعری ادراکات عمیق و بسیط ہیں جن میں عمرانی شعور جھانکتا ہوا نظر آتا ہے وہ حقیقی زندگی کی حقیقتوں کی شناور ہیں ان کے کلام سے قاری کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے تخیل کی اڑان بہت بلند ہے ان کی ایک غزل کا ایک شعر قابل غور ہے ؎

لرزو نہ پانیوں میں پڑے عکس کی طرح

پیچھے ہٹو نہ سطوتِ آزار دیکھ کر

مذکورہ استشہادات مشتے از خروارے کے مصداق ہیں ان کا تمام تر کلام سراپا انتخاب ہے ان کے ہاں بے پناہ شعری رجحانات ہیں ان گنت موضوعات ہیں خوبصورت استعارات و ترکیبات و تشبیہات ہیں مزید شعری ریاضت ان کے لیے فزوں تر معیارات کی ضامن بن سکتی ہے

○

# غزل

کشور ناہید، لاہور

ایک ہی آواز پر واپس پلٹ آئیں گے لوگ
تجھ کو پھر اپنے گھروں میں ڈھونڈنے جائیں گے لوگ

ڈوبتے سورج کی صورت میرا چہرہ دیکھ لو
پھر کہاں بابِ معانی ڈھونڈنے جائیں گے لوگ؟

مت کہو قسمت ہے اپنی بے دلی ، ناگفتنی
پھر سحر ہوگی درخشاں پھر بھلے آئیں گے لوگ

پل جھپکنے تک ہے یہ ہنگامۂ وارفتگی
جب نظر سے دور ہو گے بھولتے جائیں گے لوگ

پھر نئی خواہش کے ذروں سے بنائیں گے نگر
پھر نئی رسمِ طلب رسمِ وفا لائیں گے لوگ

منحصر رنگوں کی آتش پر نہیں ہے دلکشی
میلے کپڑوں میں بھی تجھ کو دیکھنے آئیں گے لوگ

# غزل

کشور ناہید، لاہور

شاعروں کے جو پاس رہتے ہیں
وہی اکثر اُداس رہتے ہیں

غم بہر طور اور بہر عالم
زندگی کا لباس رہتے ہیں

داغ دل کے کبھی محبت میں
بن کے سینے میں آس رہتے ہیں

دل کی دھڑکن بھی اب نہیں میری
آپ کیوں اتنے پاس رہتے ہیں؟

دل بہت ڈھونڈتا ہے تنہائی
ہم بہت اُن کے پاس رہتے ہیں

# کومل جوئیہ بے باک لہجے کی شاعرہ

ازمنۂ رفتہ میں بنتِ حوا کو بہت سی سماجی جکڑ بندیوں کا سامنا رہا مسلسل ذہنی ارتقا کے نتیجے میں ان میں کمی واقع ہوئی اظہار رائے کے حوالے سے اب مستورات کو اُن دشواریوں کا سامنا نہیں رہا جو گزشتہ ادوار کا حصہ ہیں اس لیے اب صنفِ نازک زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی حیثیت کو منوانے میں مصروفِ عمل ہے گلشنِ شعر میں بہت سی شاعرات اپنی صلاحیتیں صرف کر رہی ہیں جن کی عرق ریزیوں کی مہک محسوس کی جا سکتی ہے یوں اپنے فطری بے لاگ اور بے باک اظہار کو یقینی بنا رہی ہے اسی حزب القلم میں سے ایک نام کومل جوئیہ کا بھی ہے جو دشتِ شعر میں نووارد تو ہیں لیکن نو آموز نہیں ہیں جن کا شعری اظہار اور لہجہ بےباک نوعیت کا ہے جسے اُن کے اظہار کی جسارت پر محمول کیا جا سکتا ہے ان کا بنیادی تعلق کبیر والا جنوبی پنجاب سے ہے ان کا اولین شعری مجموعہ ''ایسا لگتا ہے تجھ کو کھو دوں گی'' مطبوعہ اکتوبر ۲۰۱۳ ہمارے زیرِ نظر ہے مجموعہ ھذا کا نام بھی خالصتاً نسائی طرزِ اظہار کا حامل ہے کتاب مذکور کے نصف اول کی غزلیات کے منتخب اشعار مع استخراجات شاملِ شذرہ ہیں۔

کومل کا شعور اظہار بہت سی جسارتوں اور بےباکیوں سے مملو ہے جو اُن کی فکری توانائی کی علامت ہے اُن کے کلام کی ابلاغیت براہ راست نوعیت کی ہے اس سلسلے میں وہ علامتوں، اشاروں اور کنائیوں سے کام نہیں لیتیں جو اُن کے بےباک لہجے کی دلیل ہے اسی نوع کی جراتوں کی تمثیل نسائی شاعری میں شاذ ہی کہیں مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔

پہلے منصف کو سردار پکارا جائے
موت کے گھاٹ مجھے شب ہی اُتارا جائے
مجھ پہ اک رنگ محبت کا چڑھایا جائے
مجھ پہ نفرت کا لگا رنگ اُتارا جائے

اُن کے سخن میں حق گوئی و حقیقت پسندی کے خواص بھی پائے جاتے ہیں جس میں نعرہ انا الحق کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے جس سے اُن کی فکری صلاحیت کی غمازی ہوتی ہے وہ محبتوں کا فروغ اور نفرتوں کی مذمت چاہتی ہیں اس لیے اُن کا اظہار محبت بھی عمومی نسائی اظہار کی ڈگر سے ذرا ہٹ کر ہے کچھ تلخ حقائق کی آموزش کے پہلو بھی ملتے ہیں۔

بچا کے رکھنا ذرا اپنی پارسائی یہاں
قدم قدم پہ فریبوں کا جال رکھا ہے

کومل کے لہجے کی بے باکی سے یہ امر اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ وہ زیست کے عمیق تجربات و مشاہدات رکھتی ہیں جن کے باعث ان کے اظہار کو بیباک انداز میں فروغ میسر آیا ہے۔

اپنا حال عیاں مت کرنا لوگوں پہ
لوگ تماشا دیکھنے والے ہوتے ہیں
سڑکوں پہ جب خون اُچھالا جاتا ہے
ٹی وی پہ بس نعرے چلے ہوتے ہیں

سماجی اور عصری بے حسی کے شواہد برجستہ طور پر اُن کے ہاں مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں اخلاق اقدار اور مکارمِ اخلاق کی بالواسطہ آموزگاری کے وسیع تر پہلو اُن کے فکری کینوس سے مترشح ہو رہے ہیں بھرپور نوعیت کے تنقیدی رویے بھی ہیں جو اُن کے افکار کی بالیدگی کے مظہر ہیں کہیں کہیں وہ ایک مصلح کے روپ میں دکھائی دیتی ہیں اُن کی فکر میں جدت و ندرت کے عوامل بھی جلوہ ریزیاں کر رہے ہیں۔

بھول بیٹھا ہے پیمبر کی کہی باتوں کو
یہ زمانہ نئی تورات طلب کرتا ہے

اُن کے تخیلات عصری تغیرات کے آئینہ دار ہیں روایتی خیالات معدوم ہیں اُن کے موضوعات میں تنوع اور مزاج میں تلون کے خصائص پائے جاتے ہیں کومل کا بے تکلفانہ اظہار اُنھیں ہم عصر شاعرات سے ممتاز و ممیز کرتا ہے۔

کچھ تو ملے ہی نہ تھے ہمیں قربتوں کے رنگ
جو دسترس میں تھے وہ انا نے گنوا دیے

کومل کے شعری کینوس میں عمومی نسائی احساسات بھی جلوہ سامانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن اُن پہ بھی اُن کی سنجیدگی کی چھاپ نظر آتی ہے جہاں قربتوں کے کیف و سرور کا مذکور ہے وہاں پندارِ انا کی بات بھی ہے اس لیے وہ ایک الگ تھلگ دنیا کی باسی نظر آتی ہیں یہی وجہ ہے

کہ ان کے ہاں ایک احساسِ ضبط کی فضا پائی جاتی ہے۔

کیسے آؤں میں تیری بانہوں میں
عشق شامل نہ کر گناہوں میں

وہ بندِ ضبط کی اہمیت و فوقیت سے بخوبی آشنا ہیں روایتی طور پر محب جنوں کا استعارہ ہوتا ہے اور محبوب خرد کی علامت ہوتا ہے لیکن کومل کے ہاں معاملہ بالکل برعکس ہے یہاں وہ پاسدارِ خرد نظر آتی ہیں جب کہ محبوب کو طرف دارِ جنوں کے طور پر دکھایا گیا ہے جو ان کا ایک طرفہ اور نادر النظیر فکری زاویہ ہے عصری آشوب بھی عصری رویوں کے طور پر سامنے آتا ہے۔

سانپ بچھو تو اب نہیں کومل
آدمی آدمی کو ڈستا ہے

عندالبیان وہ انسان کے بھیانک روپ کو بھی زیرِ بحث لاتی ہیں اس لیے ان کے سخن کو عمومی نسائی شاعری سے موسوم کرنا بھی ایک صریح زیادتی ہے کومل کا رشتہ ماضی و حال اور مستقبل سے مستقل بنیادوں پر استوار ہے اس لیے ان کے ہاں رفتہ ساعتوں کی حسین یادیں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

کبھی حسن و محبت کی علامت ہم بھی ہوتے تھے
قیامت نہ گزرتی تو قیامت ہم بھی ہوتے تھے

جہاں ماضی کی حسین یادیں ان کے شعری شعور کا حصہ ہیں وہاں احساسِ جمال اور احساسِ خود محبوبی کی جھلک بھی ملتی ہے جسے صنفِ نازک کے فطری حق پر بھی منضبط کیا جا سکتا ہے عصری صداقتوں کا رنگ بھی دیدنی صورت میں ملتا ہے۔

وہ زہر گھلا ہے سچ کا میری چھدوں میں
اٹھانی پڑتی ہے خوابوں کی روز لاش مجھے

حق گوئی و بے باکی کومل کے تخیل کا طرۂ امتیاز ہے جس کے باعث ان کا سخن منفرد و ممتاز ہے صداقت پسندی کے پہلو بہ پہلو محرومیوں اور حسرتوں کی ایک داستاں ملتی ہے کہیں کہیں انقلابی افکار بھی ضو پاشیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

کومل تجھ پہ دشمن کیسے غالب آئے گا؟

اپنے قلم کو تم نے تیر کی صورت دینی ہے

شاعرہ موصوفہ کی جرأت و جسارت لائقِ تحسین و ستائش ہے اُن کی بھاشا کے شبدوں میں شگفتگی کا آدرش پایا جاتا ہے جو شاعرات کے سخن میں شاذ ہی کہیں ملتا ہے اور داخلی آشوب کی عمدہ تمثیلات بھی پائی جاتی ہیں۔

بن آئینہ مرے خال و خد تو سنور گئے
میری آنکھیں کتنی اُداس ہیں تجھے کیا پتہ؟

اُن کی خارجیت اور داخلیت میں ایک فکری مغائرت کا سماں ملتا ہے جو حیرت و استعجاب سے مملو ہے جس میں متنوع کیفیات طرفگیٔ حسن کی غمازی کرتی ہیں

یا ہجر کی بدن سے اذیت نکال دے
یا میرے دل سے محبت نکال دے

کومل جوئیہ کے شعری اظہار اُن کے مزاج کی بے تکلفی سے عبارت ہے جس سے اُن کی فکری بالیدگی کے آثار ملتے ہیں اُن کا لہجہ تندرست و توانا اور بے باک نوعیت کا ہے انھوں نے مفرد و محذوف بحور میں سخن سنجی کی ہے ابھی انھیں فکر و فن کی وسیع تر ریاضت درکار ہے اُن کے بہتر شعری مستقبل کی بشارت دینا بھی قرینِ فطرت ہے۔

آسماں تک ہوئی ہے مہنگائی
صرف انسان ہے جو سستا ہے

○

# غزل

کومل جوئیہ، کبیر والا

یوں تو مجھ کو بھی وہ تلوار دیا کرتا ہے
وار سے پہلے ہی مگر مار دیا کرتا ہے

جن کے شانوں پہ مجھے سر ہی دکھائی نہ دے
یہ قبیلہ انھیں دستار دیا کرتا ہے

اس کی شطرنج کی چالیں بھی عجب ہیں کتنی؟
جیت کے مہرے سبھی ہار دیا کرتا ہے

جب کڑی دھوپ اُتر آتی ہے سر پر لوگو
کون پھر سایۂ دیوار دیا کرتا ہے؟

کاٹ دی آج زباں سن کے حقیقت اس نے
جو مجھے جرأتِ اظہار دیا کرتا ہے

یہ بھی کچھ کم تو نہیں اس کی عنایت کوملؔ
حوصلہ مجھ کو سردار دیا کرتا ہے

# غزل

**کوملؔ جوئیہ، کبیر والا**

مسافر کو ہمیشہ کی مسافت مار ڈالے گی
ٹھہرنے کی طلب جانے کی عجلت مار ڈالے گی

جہاں چاروں طرف ویرانیوں کے عکس روشن ہیں
مجھے اس آئینہ خانے کی حیرت مار ڈالے گی

یہ رستہ بے نشاں منزل کی جانب لے کے جاتا ہے
تمھیں میں نے کہا تھا نہ محبت مار ڈالے گی

مجھے معلوم ہے کہ ہجر جاناں جزو لازم ہے
بچھڑتے وقت ان آنکھوں کی وحشت مار ڈالے گی

گلابی تتلیاں ماتھے پہ آ کر رقص کرتی ہیں
ترے ہونٹوں کی اک تازہ شرارت مار ڈالے گی

ہر اک شاخ شجر سے ان کا کوئی دل کا رشتہ ہے
پرندوں کو مجھے لگتا ہے ہجرت مار ڈالے گی

# گل زیب زیبا کا کلام اور عصری آشوب

تخلیق کار یا سخنور کا کام حالات و واقعات کو حقیقی انداز میں بیان کرنا اور زیست کے مصائب و آلام کا مداوا تلاش کرنا ہے عموماً چونکہ حالات نا مساعد رہتے ہیں اس لیے عہد کی آشوب زدگیوں کا مذکور عصری آشوب کہلاتا ہے جن سخن گستروں کا کلام ان کیفیات و واردات سے عبارت ہوتا ہے اُن کے ہاں عکسِ دوراں واضح طور پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اسی لیے ان کے سخن کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے شذرہ طذا میں ہم گل زیب زیباؔ کی سخن سنجی کے حوالے سے رقمطراز ہیں جن کی شاعری مذکورہ خصوصیات سے متصف ہے اُن کے شعری مجموعہ مطبوعہ 1998ء ''گلِ ریگزار'' کے نصف اول کی منتخب غزلیات شاملِ تجزیہ کرتے ہیں گل زیب زیباؔ کا تعلق دبستانِ کراچی سے ہے اور ان کے شوہر نثار احمد نظامانی ضلع سانگھڑ کے ایک زمیندار ہیں زیباؔ جی کے ہاں ذوق و شوق پوری فراوانی سے موجود ہے کتاب طذا کے پیش لفظ ''میں اور میری شاعری'' میں لکھتی ہیں: ''پروفیسر آفاق صدیقی کو مع اہلیہ اپنے گھر اٹھا لائی اور اس مجموعے پر جبری اصلاح لی پھر محسن بھوپالی کو زحمت دی اور ان سے کلام کے انتخاب میں مشورہ لیا۔''

انسانی طبائع میں وہ انقلاب آیا کہ خلوص و مروت نے اپنی بساط لپیٹ لی جس کے لازمی نتیجے کے طور پر غرور و تکبر نے فروغ پایا اور پندارِ خدائی کے باعث ہر شخص کی گردن اکڑ رہ گئی ایک لایعنی انا کا بول بالا ہوا ہے جب انسانی رویے ناہموار ہوں کج روی عروج پر ہو تو ایک حساس دل انسان محوِ فریاد اور مصروفِ فغاں ہو جاتا ہے جس کے ناخوشگوار اثرات ماحول پر بھی مرتب ہوتے ہیں تو پھر ہوائیں روٹھ جاتی ہیں حبس زدہ موسم میں حیاتِ انسانی کی سانسیں گھٹ کر رہ جاتی ہیں پھر زیست ایک عقوبت ناک منظر پیش کرتی ہے حقیقی انا کا خون ہو جاتا ہے ہر سو ظلمت و وحشت ایک مہیب منظر پیش کرتی ہے جب ہر ہاتھ میں خنجر اور ہر آستین پر خون ہو تو پھر سماج قاتل و ستمگر کا روپ دھار لیتا ہے سنسار دوزخ سماں بن جاتا ہے جیسا کہ آج کل کراچی کے حالات ہیں اسی طرزِ فکر کے حامل ان کی غزل کے چار اشعار دیدنی ہیں ؎

بکھری ہوئی ہے تیری انا تیرے شہر میں
ہر شخص بن گیا ہے خدا تیرے شہر میں
دیتی رہی ہوں روز صدا تیرے شہر میں

کترا رہی ہے مجھ سے ہوا تیرے شہر میں
جینا بھی ہو گیا ہے سزا تیرے شہر میں
خنجر ہر ایک ہاتھ میں ہر آستیں پہ خوں
زیبؔا کو کس نے قتل کیا تیرے شہر میں؟

حالات کے بگڑنے اور مسائل کے الجھنے کے اسباب جب بے چگونی کیفیت اختیار کر جاتے ہیں تو پھر گومگو کا وہ عالم ہوتا ہے کہ انسان سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جان پاتا اور اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا ایک حساس انسان تا حیات وفاؤں کی پالنا کرتا رہتا ہے اور مروتوں کا خوگر رہتا ہے اس سعیِ جمیل میں اپنا سب کچھ وار دیتا ہے قدرتِ ایزدی انسان کو زندگی کرتے کا حوصلہ دیتی ہے اور وہ حیات کی کٹھنائیوں کے آگے سینہ سپر ہو جاتا ہے گل زیب زیبؔا کے ہاں فنی چابکدستی کا یہ عالم ہے کہ وہ مشکل ردیفوں، قوافی اور سنگلاخ زمینوں میں زبردست مضمون آفرینی کے جوہر دکھلاتی ہیں اور اُن کے تخیل کی جولانی اور روانی پوری آب و تاب سے کارفرما ہے اسی تناظر میں اُن کی غزل کے چار اشعار دیکھیں ۔

کس نے کیا ہے خون جگر کچھ نہ پوچھیے؟
ہم خود بھی جانتے ہیں مگر کچھ نہ پوچھیے

راہِ وفا میں ایسے بھی کچھ مرحلے رہے
ہم نے جلایا اپنا ہی گھر کچھ نہ پوچھیے
وہ کون سی طلب تھی کہ ہم تنہا ہو رہے؟
دنیا کے آگے سینہ سپر کچھ نہ پوچھیے
عہدِ وفا کا ہم نے بھرم اس طرح رکھا
خود کو کیا ہے خاک بسر کچھ نہ پوچھیے

محبت کا فقدان انسان کو وحشت کی ہولناکیوں سے ہم آغوش کر دیتا ہے عالمِ ہجراں میں دامن چاک اور گریباں تار تار ہو جاتا ہے پھر کوئی رفوگر میسر نہیں آتا یہ صورتِ حال اس امر کی غمازی

کرتی ہے کہ دلِ دریدہ کو الفت نہیں ملی اسی حوالے سے اُن کا ایک قطعہ لائقِ توجہ ہے ؎

آنکھوں کو اشک چہرے کو وحشت نہیں ملی
شاید تمھیں کسی کی محبت نہیں ملی
دامن ہی چاک ہے نہ گریبان تار تار
کیا یارِ دل نواز کی صحبت نہیں ملی؟

جب دروں کی دنیا میں حزن والم کے لاوے اُبلتے ہیں تو پھر کتھارسس کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور داخلی اظہار کو فروغ ملتا ہے اگر زبانِ اظہار سے قاصر رہے تو داخلی دنیا غم و یاس کی آماجگاہ بن جاتی ہے اس لیے کتھارسس کی اہمیت مسلمہ و مصدقہ ہے اسی نسبت سے اُن کی غزل کا یہ شعر لائقِ التفات ہے ؎

وہ دل کا مرے ناسور بنی
جو بات زباں نہ کہہ پائی

حالات کی واژگونی اس قدر پرہول صورت اختیار کر گئی ہے کہ انسان کو کہیں بھی جائے اماں میسر نہیں ہے جب وحشتوں کا دور دورہ ہو تو جان بچانا بہت بڑا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے اس عصری آشوب کی غمازی اُن کی غزل کے اس شعر میں قابلِ غور ہے ؎

یہ بہت ہے کہ شر کے میلے میں
جان اپنی بچا کے گھر لاؤں

مشمولہ استشہادات اس امر کی شاہد دل ہیں کہ گل زیب زیبا کے فکری کینوس میں عصری حالات کی واژگونی کا بھرپور اظہار موجود ہے جس کا واضح سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد سے اثر قبول کیا اور اپنے عصر کو متاثر کرنے میں بھی خاطر خواہ حد تک کامیاب ہوئی ہیں اگر تواتر سے اُن کا ریاضِ شعر جاری و ساری رہا تو اُن کے سخن سے اُن کے دور کی سنگینی مزید اُجاگر ہو کر سامنے آئے گی۔

○

# غزل

## گل زیب زیبا، کراچی

جو چاہتوں کے سراب ٹوٹے
تو میری راہوں کے خواب ٹوٹے

کل آئینے میں جو خود کو دیکھا
عجب طرح کے عذاب ٹوٹے

سکوت کتنا ہے زندگی میں؟
وہ آئیں تو کچھ عتاب ٹوٹے

وہ حال پوچھا کیے جو ہم سے
لبوں پر آ کے جواب ٹوٹے

مثالِ برگِ خزاں ہیں اب تو
نہ جانے کب یہ حباب ٹوٹے؟

# غزل

**گل زیب زیبا، کراچی**

بن ترے شب گزار لی میں نے
کیا قیامت سہار لی میں نے؟

دیکھ اے جانِ جاں تری صورت
لوحِ دل پر اُتار لی میں نے

تیری آنکھیں یہ تیرے لب جن سے
زندگانی اُدھار لی میں نے

آہ اک عمر گروی رکھی تب
دو دنوں کی بہار لی میں نے

# ناہید شروانی کی رویوں کی عکاس غزل

ہر تخلیق کار کسی نہ کسی حد تک ترجمانِ معاشرہ ہوتا ہے اس کا مواد داخل و خارج کا مرہونِ منت ہوتا ہے خارجی طور پر اثرات قبول کرتا ہے جسے دروں کی سیر کرانے کے بعد پھر خارج کی نذر کر دیتا ہے جس میں اس کے عہد کے رویے کار فرما ہوتے ہیں سلوکِ دوراں کی بازگشت بھی ہوتی ہے احباب کے روا و نا روا رویے بھی ہوتے ہیں۔ آج ہم ایسی ایسی شاعرہ کے حوالے سے اپنے تاثرات و تجزیات سپردِ قرطاس کرنے جا رہے ہیں جن کا سخن رویوں کی عکاسی کا حامل ہے ہماری مراد ناہید شروانی ہیں جن کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی اور قیامِ پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہوئیں اور یہاں مستقل طور پر اقامت گزیں ہیں ان کا اولین شعری مجموعہ ''نویدِ سخن'' مطبوعہ ۲۰۱۲ء ہمارے زیرِ نظر ہے جس میں زیادہ تر غزلیات اور نظمِ منثور شامل ہے جبکہ پابند و آزاد نظمیات بھی خال خال نظر آتی ہیں کچھ متفرقات بھی کتاب ہذا کا حصہ ہیں مجموعۂ مذکور کے حوالے سے سرور جاوید، ڈاکٹر مظہر حامد، ڈاکٹر نزہت عباسی کے شذرات اور پروفیسر آفاقی صدیقی کے تاثرات شامل ہیں بقول ناہید شروانی ان کا کلام ۱۹۵۷ء سے چھپنا شروع ہوا لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ نصف صدی سے زائد عرصہ شعر کہتے ہوئے بیت جانے کے بعد بھی ان کے کلام میں اوزان کے بنیادی مسائل اور غلط قوافی کی بندش کا استخدام ملتا ہے ان کے مذکورہ مجموعہ کی غزلیات کے منتخب اشعار موضوع کی مناسبت سے مع استخراجات شاملِ مضمون ہیں۔

ان کی غزل کے دو اشعار لائقِ توجہ ہیں:

کوشش نباہ کی تو رہی میری عمر بھر
لیکن وہ شخص میرا کبھی ہو سکا نہ تھا
ناہید زندگی ہے مری اضطراب میں

اس جرم کی سزا ہے جو میں نے کیا نہ تھا

ناہیدؔ کے سخن میں محبوب کے ناروا رویّوں کا مذکور بھی ہے اور اپنی وفا شعاری کا تذکرہ بھی ہے زیست کے مصائب و آلام کی بازگشت بھی مہیب صورت میں سنائی دیتی ہے وہ محبت سے شاکی ہیں اور حیات سے نالاں ہیں جس کے باعث ایک عمیق طرز کا حزنیہ احساس پنپتا ہوا محسوس ہوتا ہے صنفِ نازک ہونے کی وجہ سے فطری طور پر ایک گہری حساسیت کی حامل ہیں خلوص، مہر و وفا، مروت و محبت اُن کے خمیر اور سرشت میں شامل ہے۔

عبارت ہو جو احساسِ وفا سے
میں اس سانچے میں ڈھلنا چاہتی ہوں
چلن دنیا کا میں کیسے بدل دوں؟
سو اب خود کو بدلنا چاہتی ہوں

اُن کا کلام سرچشمۂ اخلاص ہے ان کے فکری کینوس میں احساسِ صدق و صفا رچا بسا ہے انھیں اوصاف سے متصف دنیا انھیں مطلوب ہے اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں مگر وہ دنیا اور اہلِ دنیا کے رویّوں سے خائف نظر آتی ہیں مایوسی کے عالم میں وہ دنیا کو بدلنے کی بجائے خود کو بدلنے کی بات کرتی ہیں جو اُن کی فکر کا کمزور ترین اور افسوس ناک پہلو ہے جس سے یاسیت و قنوطیت کی لہر اٹھتی ہوئی نظر آتی ہے اس لیے شہنازِ مرگ سے ہم آغوش ہونے کی خواہش اُن کے ہاں فزوں تر دکھائی دیتی ہے۔

ناہیدؔ ہم نے جھیلے ہیں دنیا میں کیا ستم؟
منزل قریب ہونے کا امکان ہو گیا

دنیا کے ستم رساں رویّوں کے باعث اُن کی فکر کا حزنیہ رنگ اجاگر ہوا ہے جو اہلِ جہاں کے سلوک کی دین معلوم ہوتا ہے اس لیے وہ خود کو قریبِ مرگ محسوس کرتی ہیں مگر پھر بھی وہ احساسِ محبت کی پالنا کرتی ہیں

محبت وہ کہ جس کو سب پیمبر لے کے آئے تھے
مگر اہلِ جہاں ان پہ بھی پتھر لے کے آئے تھے

نہ تھے احباب میرے مختلف اعدا سے شاید
چھپا کر آستینوں میں وہ خنجر لے کے آئے تھے

ان کے فکری کینوس کی سیر حاصل سیر کی بدولت محبت کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے مگر اس پر اہلِ جہاں کی چیرہ دستیوں کی داستاں بھی ملتی ہے یہی سبب ہے کہ انھیں احباب و اعدا ایک ہی صورت میں دکھائی دیتے ہیں ناہید کے تخیلات ان کے تلخ تجربات و مشاہدات کے عکاس ہیں بسا اوقات وہ جہاں اور اہلِ جہاں کو حق بجانب گردانتی ہیں خود کو خود احتسابی اور خود انتقادی کے کڑے عمل سے گزارتی ہیں جو ان کی ذات کی سچائی کی دلیل ہے۔

کچھ کمی ناہید ان کی عنایت میں نہ تھی
اس لیے پہلے مجھے کرنا ہے اپنا احتساب

مشمولہ استخراجات سے یہ امر اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ ناہید شروانی نے رویوں کے ترجمانی غزل کی زبانی انتہائی عمدگی سے کی ہے ان کا اسلوب سادہ و شستہ ہے جو سہل نگاری کی روایت کا حامل ہے اور اخلاص کی سچائی سے ڈھلا ہوا ہے لیکن ان کے شعری مجموعہ کے بنظرِ غائر مطالعہ سے جس میں ابھی بہت کچھ بہتری کی گنجائش موجود ہے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ابھی ان کے فکروفن کو فزوں تر بالیدگی مطلوب ہے۔

* * *

# غزل

**ناہید شروانی ، کراچی**

میں وہ بات کہنا نہیں چاہتی تھی
مگر چپ بھی رہنا نہیں چاہتی تھی

مرا ضبط تھا میرا دردِ نہاں تھا
کسی رو میں بہنا نہیں چاہتی تھی

مرا فیصلہ کچھ تھا لیکن بیاں کچھ
میں اب درد سہنا نہیں چاہتی تھی

مرے گاؤں میں کل منادی تھی کوئی
میں اس لیے قید رہنا نہیں چاہتی تھی

کبھی میں نے ناہیدؔ سوچا نہیں تھا
وہ کیا تھا جو کہنا نہیں چاہتی تھی؟

# غزل

## ناہید شروانی، کراچی

بڑی بے بسی آج محسوس کی
تمھاری کمی آج محسوس کی

مری ہر نگارش تمھارے لیے
یہ وابستگی آج محسوس کی

مری زندگی میں اُجالا تھا کب؟
مگر تیرگی آج محسوس کی

تمھیں ساتھ دیکھا کسی اور کے
بہت بے کلی آج محسوس کی

تصور میں میرے تو تم ہی رہے
عجب روشنی آج محسوس کی

مری زندگی میں تھی جس کی کمی
وہ کیا چیز تھی آج محسوس کی

محبت میں ناہیدؔ یہ بے خودی!
عجب سادگی آج محسوس کی!

# نجمہ انصار نجمہ کا فکری تنوع

شاعری مختلف افکار و خیالات سے عبارت ہے موضوعات و تخیلات میں وسعت و تنوع بسیط فکری کینوس کی عکاسی کرتے ہیں آج ہم نجمہ انصار نجمہ کی شعر گوئی کی نسبت سے رقم طراز اس وقت ان کا اولین شعری مجموعہ "زخمۂ احساس" مطبوعہ 2000ء ہمارے زیرِ نظر ہے جس میں تمام تر غزلیات شامل ہیں اور کلاسیکی شعرا کی طرز پر ردیف وار مرتب کیا گیا ہے جسے عرفِ عام میں دیوان کہا جاتا ہے نجمہ انصار نجمہ کا اگرچہ بنیادی تعلق کراچی سے ہے لیکن ستر کی دہائی سے تا دمِ تحریر اپنے شوہر انصار حسین کے ہمراہ برطانیہ میں مقیم ہیں اور وہاں اردو ادبی حلقے میں اپنی ایک خاص پہچان رکھتی ہیں وہاں کے مشاعروں میں بھی تواتر سے شرکت کرتی رہتی ہیں ان کے موضوعات میں گوناگوں افکار نکہت بیزیاں کر رہے ہیں ان کے مذکورہ مجموعہ سے چند غزلیات کے منتخب اشعار برائے تجزیات زینتِ قرطاس ہیں۔

ان کا فکری کینوس اصل میں مختلف رنگوں کی ایک قوسِ قزح ہے جس میں ایک رنگ حزن و ملال کا بھی ہے جنھیں وہ اساسِ دل اور اساسِ حیات سمجھتی ہیں وہ مصائب و آلام سے نالاں نظر نہیں آتی بلکہ وہ غم والم کی رفعت کی قائل ہیں۔

غم سے ہی دل کا ہے بھرم نجمہ
غم نہ ہوگا تو دل کا کیا ہوگا؟

نجمہ کا سخن اخلاص کی دولتِ بے پایاں سے مالامال ہے اسی حوالے سے وہ کسی نوع کی قربانی سے گریز نہیں کرتیں وہ راہِ محبت میں ہر نوع کے غم کو گوارا کرنے کی قائل ہیں جو ان کی

مروت والفت کی شاندار دلیل ہے۔

ہم اسی امید پہ سہتے رہے دنیا کے غم
آدمی اک دن محبت آشنا ہوجائے گا

نجمہ انصار نجمہ کے افکار میں عزم و حوصلہ کا آدرش ملتا ہے اُن کی ہمت جواں ہے اور وہ کسی نوع کے خوف کو خاطر میں نہیں لاتیں حصولِ منزل کے حوالے سے ایک کامیابی کا بھرپور تاثر ملتا ہے۔

ڈرا نہ پائیں گے ہم کو یہ سرپھرے طوفاں
کہ موجِ عزم تو جا کر رُکے گی ساحل پہ

نجمہ کی شعریات میں بے پناہ رجائی امکانات کارفرما نظر آتے ہیں ایک اعتماد کی فضا ہے جو اُن کے کلام کے گرد حاشیہ آرائی کیے ہوئے ہے اس عہدِ پُرآشوب میں رجائیت آمیز سخن کسی اعجازِ مسیحائی سے کم نہیں ہے۔

نجمہ ترے افکار کی تعمیر کو ہرگز
ممکن نہیں کر دے کوئی تخریب سبوتاژ

اُن کا کلام تاثیر کی فزوں تر دولت سے مزیّن ہے ایک اپنائیت کا احساس ہے جو پروان چڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے اُن کی شاعری سے سادہ کاری اور پرکاری کا تاثر اُجاگر ہوتا ہے۔

بے گناہی عدل کے میزان پہ بے وزن تھی
دار تک لے آئی ہم کو ایک عادل کی تلاش

دیوانِ نجمہ میں ناروا رویوں کی بازگشت انتہائی موثر انداز میں سنائی دیتی ہے سماجی و اخلاقی اقدار کا انحطاط جاں گسل صورت اختیار کیے ہوئے ہے عصری بے حسی کی مذمت بھی اُن کا مندوب موضوع ہے۔

حصولِ زر کے لیے بے ضمیر ہے انساں
طمع ہی بڑھتی چلے جس قدر کہ ہو افراط

نجمہ کے ادراکات بسیط و بلیغ ہیں اُن کا وجدانِ سخن کثیر الجہات ہے اُن کے فکر و فن میں وہ

بالیدگی ہے جو عصرِ حاضر کے شعرا و شاعرات میں شاذ ہی پائی جاتی ہے انھوں نے زیادہ تر مفرد و محذوف بحور میں بطریقِ احسن ریاضت شعری کی ہے اور النظیر قوافی اور ردیفوں کا استخدام انتہائی قرینے سے کیا ہے ان کے افکار میں رفعت اور ادراکات میں عظمت پنہاں ہے ان کا کلام فروغِ آگہی میں اہم کردار ادا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے فکری و فنی ارتفاع کے لوازماتِ شعری اپنی پوری آن بان سے موجود ہیں۔

کیجیے اب وا دریچے عقل کے
قید ہو کیوں فکر و فن کا ارتفاع؟

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان کے حصے میں وہ شہرت و مقبولیت نہیں آئی جس کا وہ استحقاق رکھتی تھیں البتہ جن اصحابِ فکر و دانش کی نظر سے ان کا کلام گزرا ہے وہ انھیں ایک معتبر شاعرہ کے طور پر تسلیم کرتے ہیں ان کی شعری صلاحیتیں ان کی فطری کاوشوں کی غماز ہیں جن میں اکتسابی پہلو نہ ہونے کے برابر ہے ان کی شاعری اس قدر وقیع ہے جو ہر عہد میں زندہ و تابندہ رہے گی اور جسے تواتر سے سراہا جاتا رہے گا۔

ایوان سے ٹکراتا ہے میرا ہر اک شعر
لیکن میں عتاقی رہی اشعار تہِ تیغ

# غزل

نجمہ انصار نجمہ، کراچی

مرنے پہ میرے عذر نہ جینے پہ اعتراض
صیّاد کو ہے زخموں کے سینے پہ اعتراض

سوچا کہ ظرف ڈوب نہ جائے مرا کہیں
آنسو جو پی لیے تو ہے پینے پہ اعتراض

اُس نے زبان کاٹ تھمائی مری ، مجھے
میں نے ذرا کیا جو قرینے پہ اعتراض

پہلو میں شیخ رکھتا ہے اپنے شرابِ ناب
کرتا ہے پر ہمارے وہ پینے پہ اعتراض

نجمہ کو ناخدا نے ڈبویا ہے اس لیے
کرتی تھی ڈگمگاتے سفینے پہ اعتراض

# غزل

### نجمہ انصار نجمہؔ، کراچی

راہِ ہستی میں عجب ہے مرحلہ
جتنا بڑھتی ہوں بڑھے ہے فاصلہ

جانبِ منزل ہوں پھر بھی گامزن
زخم بنتا جائے ہے ہر آبلہ

آرزوؤں کے دیے جب جب جلے
آندھیوں کا چل پڑا اک سلسلہ

وقت کے ہمراہ کوئی کیا چلے؟
وقت کے سینے میں مضمر زلزلہ

آپ ہم کو ساتھ لیتے جائیے
ایک سے اچھا ہے دو کا قافلہ

خود بخود ہو جائیں گے حل مسئلے
دیکھیے مت ہاریے گا حوصلہ

ہے فقط نجمہؔ گلہ تقدیر سے
اس زمانے سے نہیں کوئی گلہ

# نسرین نکہت سبزواری کے فکری رجحانات

تخلیق کار کی کائناتِ فکر بہت بسیط ہوتی ہے جس میں تنوع وترفع کے خصائص ناگزیر ہوتے ہیں جب تخلیقیت میں وسعت پیدا ہوتی ہے تو قوتِ متخیلہ نادرالمظیر فکری زاویوں سے آشنا ہوتی ہے جہاں فکری سطح بلند ہوتی ہے وہاں کچھ فلسفیانہ نوعیت بھی اختیار کرتی ہے جس سے حسیاتی عمق آشکار ہوتا ہے ایک تازہ کاری نموپاش وتی ہے اور ایک کرشمہ کاری کا احساس پایا جاتا ہے زیست کے نادرالوقوع واقعات ہیجان انگیز کیفیت کو جنم دیتے ہیں کہیں بیزاری وسوگداری کے شواہد ملتے ہیں تو کہیں زندگی مکمل تاب وتوانائی کے ساتھ سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے حزنیہ اور طربیہ عوامل مصروفِ عمل رہتے ہیں طربیہ تاثرات غیر مستقل کیفیت کے حامل ہوتے ہیں جب کہ ان کے برعکس احساساتِ حزن کو مقامِ استحکام حاصل ہوتا ہے اس لیے دیرپا حیثیت رکھتے ہیں آج ہم مکینِ لاہور معروف شاعرہ نسرین نکہت سبزواری کی شعر گوئی کے حوالے سے رقم طراز ہیں جن کا فن مذکورہ خصوصیات سے متصف ہے۔

نسرین نکہت کے سوانحی کوائف کی اجمالی جھلک کچھ یوں ہے:

ان کا تعلق ایک سید خانوادے سے ہے جو اعلیٰ تعلیم پس منظر رکھتا ہے۔ ان کے والدِ گرامی سید خورشید حسین واسطی انجینئرنگ کے شعبہ سے وابستہ ہیں ان کے دادا کلکٹر کے منصب پر فائز رہے ان کی پیدائش بہاول پور میں ہوئی گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازی خاں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ کالج برائے خواتین فیصل آباد سے گریجویشن کی ڈگری نمایاں نمبروں کے ساتھ حاصل کی بعد ازیں انگریزی ادبیات میں پوسٹ گریجویٹ کیا لاہور کے معروف تعلیمی

ادارے ڈویژنل پبلک اسکول ماڈل ٹاؤن میں تدریسی عمل کا آغاز کیا جس میں 2005ء تک انگریزی شعبہ کی انچارج رہیں شعر و ادب کا شوق و شغف انھیں اوائل عمری سے ہے ان کے چند افسانے جن میں ‘‘زعفران’’ اور ‘‘پھول’’ بھی شامل ہیں۔ روزنامہ جنگ کی زینت بنے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھتی ہیں جو ‘‘نونہال’’، ‘‘آنکھ مچولی’’ اور ‘‘تعلیم و تربیت’’ جیسے بچوں کے معروف جرائد میں چھپتی رہتی ہیں ان کا اولین شعری مجموعہ ‘‘آئینوں کے زخم’’ 2005ء میں منصۂ شہود پر آیا علاوہ ازیں ‘‘دلِ صحرا’’ 2012ء میں منصۂ شہود پر آیا جب کہ 2013ء میں بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ‘‘پیا جی کا اسکول’’ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا نسرین نکہت سبزواری کا تخلیقی ارتقا انتہائی دھیمے انداز میں جاری و ساری ہے جو بے حد وقیع اور حوصلہ افزا ہے۔

نسرین نکہت کے حوالے سے معروف شاعرہ ڈاکٹر شہناز مزمل کے تاثرات سپردِ قرطاس ہیں۔

‘‘درد نے جو الاؤ نسرین نکہت سبزواری کے اندر بھڑکایا ہے اس نے ان کے اندر کے موسم کو تبدیل کر دیا ہے وہ کرچیوں بھری جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتی ہیں ایسے خواب جو نوید زندگی دیتے ہیں اور درد و یاس کے دریا کو عبور کرنا آسان نظر آنے لگتا ہے ورنہ جلتی دھوپ میں ننگے پاؤں چلنا بے حد دشوار کام ہے آرزو کا طلسم بھی انسان کو گھیرے رکھتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خزاں بھی نوید بہار نہیں بنتی لیکن وہ نا امید نہیں۔’’

عصرِ حاضر کے جواں فکر شاعر کرامت بخاری کچھ یوں گویا ہیں:

‘‘نسرین نکہت سبزواری نظم لکھیں یا نثر دونوں اصناف میں انسانی جذبوں کی آنچ دھیمی دھیمی مگر تسلسل کے ساتھ محسوس ہوتی چلی جاتی ہے روزمرہ تشبیہ، استعارہ ان کے اسلوب اور عام فہم زبان ہر تخلیق کو تاثیر عطا کرتی ہے۔’’

ان کے موخر الذکر شعری مجموعہ جو غزلیات و پابند نظمیات کا مرقع ہے کے تناظر میں ان کے فکری رجحانات و میلانات کا تنقیدی جائزہ سپردِ قرطاس ہے غزلیات کے منتخب اشعار میں سے چند استخراجات شاملِ استشہادات ہیں انھوں نے اچھی خاصی متاثر کن پابند نظمیں بھی کہیں ہیں لیکن ان کا حقیقی تخلیقی جوہر غزل میں کھل کر سامنے آیا ہے وہ وسیع و عریض فکری کینوس کی حامل ہیں

جس میں ایک بوقلمونی اور رنگا رنگی ہے متانت و سنجیدگی حدِ کمال کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے جس سے اُن کی فکری بالیدگی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ عصری شاعری فکری و فنی اعتبار سے رطب و یابس کا شکار ہے یہی وجہ ہے کہ شاعری میں حقیقی توانائی و رعنائی معدوم ہو گئی ہے افکار میں یاسیت و قنوطیت اور حزن و ملال کی اجارہ داری ہے لیکن نسرین نکہت کے ہاں ایسا ہرگز نہیں ہے اُن کے موضوعاتی کینوس میں طرب و رجا کی پیوندکاری احساس کی تازہ کاری کے ساتھ کارفرما ہے جس سے زیست کو ولولہ و حوصلہ میسر آتا ہے اور قاری کو زندگی کرنے کی بھرپور تشفی ملتی ہے وہ مایوسی اور افسردگی نہیں بکھیرتیں بلکہ اُن کا تخیل بہت سی خوش گواریوں اور لطافتوں کو جنم دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

پھر بہار آئے نہ آئے آؤ کچھ ایسا کریں
زندگی کے سارے لمحوں کو بہار افزا کریں
پھول امیدوں کے گلشن میں سدا کھلتے رہیں
دل کے جذبوں میں مہک افشا کریں

اُن کے افکار میں استفساری رویوں کے پہلو بہ پہلو توکل و استغنا کے اوصاف پائے جاتے ہیں جس سے یہ امر اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ وہ قدرتِ کاملہ پر مکمل یقین رکھتی ہیں اس سے اُن کے تخیلات کی شستگی جلوہ ریز ہوتی ہے۔

کیا وفاؤں کا وہ صلہ دے گا؟
جو بھی دے گا ہمیں خدا دے گا

نکہت سبزواری کے معدودے چند اشعار ایسے ہیں جو عالم گیر سچائی کا درجہ رکھتے ہیں جن میں زباں زدِ عام ہونے کی خصوصیت پائی جاتی ہے اور بے پناہ ابلاغیت کے حامل ہیں۔

جو ایک بار نگاہوں سے گر گیا نکہت
کسی نگاہ میں اس کو وقار مل نہ سکا
واعظ کی پارسائی بھی بس دیکھنے کی تھی
جنت کا تھا بہانہ مگر حور تک گئے

نکہتؔ کے شعری کینوس میں عمومی عمرانی رویّے بھی وفور سے ملتے ہیں اسلوب میں وہ سلاست و روانی ہے جس کا ابلاغ براہِ راست نوعیت کا حامل ہے اور مقصدیت سے معمور بھی ہے مادی و میکانی عوامل پہلو بہ پہلو ملتے ہیں جو بالواسطہ طور پر اخلاقیات کا درسِ زریں ہے۔

رسمِ جہاں کی سب کو پڑی ہے دین کی ہم کو فکر کہاں؟
ایسے عالم میں تم مجرم کس کس کو ٹھہراؤ گے

تنقیدی شواہد سے اُن کی بالغ نظری منکشف ہوتی ہے اور زندگی اپنے حقیقی انداز میں سانس لیتی نظر آتی ہے جس سے زیست کے مصائب و آلام اور محاسن و معائب بخوبی مطالعہ و مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔

زیست اک بوجھ بن گئی ورنہ
ہم بھی جینے کی آرزو کرتے
دوسروں کی لغزشوں کا رہتا ہے ہر دم خیال
اپنی خامی پر کبھی اپنی نظر ہوتی نہیں

اُن کے تخیلات میں عصری آشوب اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ کارگر نظر آتا ہے عصری رویّوں کی بھرپور پاسداری ہے یوں اُن کا کلام عصری رجحانات و میلانات سے ہم آہنگ ہے۔

بہہ رہا ہے ہماری گلیوں میں
خونِ آدم بہت ہی ارزاں ہے
ہر طرف آگ اور لہو کا کھیل
آج انسان خود ہی شیطاں ہے

جذبات و احساسات میں شدت ہے اس لیے اُن کا لہجہ بلند بانگ ہے اور غم کی آنچ شدید نوعیت کی ہے جو قاری کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

ہمیں جینے کا سلیقہ ہی نہ آیا نکہتؔ
روز احساس کی سولی پہ چڑھا کرتے ہیں

نکہتؔ کے جذبوں میں ایثار و خلوص کی آمیزش اپنی دل کش صورت میں موجود ہے۔ اُن

کے ہاں محبتوں کا ایک درسِ بلیغ ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کے افکار میں نالہ وشیون کی روایت مفقود ہے۔

آؤ غم بانٹ لیں اوروں کے یہی ہے بس میں
آؤ ہم پیار سے دنیا کو عبارت کر لیں

نسرین نکہت سبزواری کا فکری کینوس متنوع رجحانات ومیلانات سے عبارت ہے جس میں ایک بالیدگی ہے انھوں نے زیادہ تر مفرد ومحذوف بحور میں باندازِ احسن سخن سنجی کی ہے اگر ان کا شعری ارتقا اسی تواتر سے جاری وساری رہا تو نئے اور بہتر امکانات کی بشارت دی جاسکتی ہے۔

* * *

# غزل

نسرین نکہت سبزواری، لاہور

ناکام چلے جائیں اگر ہم تیرے در سے
مایوس نہ ہوجائیں وفاؤں کے اثر سے

ہر گام پہ بکھرے ہیں یہاں درد کے کانٹے
گزرے نہ کوئی عشق کی اس راہ گزر سے

اک آگ کا رستہ ہے یہ شعلوں کا سفر ہے
ہوتی ہے کہانی یہ رقم خونِ جگر سے

دیکھی نہیں جاتی ہے اب انسان کی تذلیل
ٹپکا ہے لہو آج مرے دیدۂ تر سے

یوں ترکِ محبت کی قسم ہم نے نبھائی
یہ آنکھ مری تیرے تصور کو بھی ترسے

# غزل

نسرین نکہت سبزواری، لاہور

یادوں کو تیری کیسے سہارا کریں گے ہم؟
تیرے بغیر جی کے بھی اب کیا کریں گے ہم؟

کچھ اور مل سکیں تو ذرا ڈھونڈ لائیے
دو چار غم سے کیسے گزارا کریں گے ہم؟

دیتے ہیں ساتھ ہوش و خرد میں سبھی مگر
دیوانگی میں کس کو پکارا کریں گے ہم؟

تجھ سے بچھڑ کے جینے کی عادت سی ہو گئی
اب تیرا ساتھ کیسے سنوارا کریں گے ہم؟

غیروں کی آس پر گر بیٹھے رہے یونہی
اپنے دکھوں کا کیسے مداوا کریں گے ہم؟

تو نے اے زندگی ہمیں کیا کیا نہیں دیا؟
کچھ اور اب نہ تجھ سے تقاضا کریں گے ہم

# نگہت عائشہ کا رنگِ سخن

حقیقی شاعری کے دیگر تلازمات کے پہلو بہ پہلو زیست کی حقیقی تصاویر پیش کرنا اور انھیں تصنع کی آلائشوں سے ماورا رکھنا ہے۔ معیاری کلام وہ ہے جو ابلاغیت سے معمور ہو سلاست و روانی جس کی شرطِ اوّل ہے جو سخن لسانی اور فکری دقیقہ سنجی کا حامل ہوگا اس میں ابلاغیت نسبتاً کم ہوتی ہے اور قاری کو لغت کے جھمیلوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے بایں سبب تاثر بھی بالواسطہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ شاعری کے خصائص میں ایک خود کلامی کی خصوصیت پائی جاتی ہے ویسے بھی کلام کو موزوں گفتگو سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شذرہ ھذا میں ہم کراچی میں مقیم شاعرہ نگہت عائشہ کی سخن سنجی کے حوالے سے خامہ پرواز ہیں جو مجموعی طور پر حزنیہ رنگ کا حامل ہے حزن و ملال کی ایک طویل داستان ہے محرومیوں کی ایک بھرپور کتھا ہے حیات کی تلخیوں کا پر تاثیر حوالہ ہے جس میں معرفت و مجاز کے شواہد مجازی اور روایتی لبادے میں کارفرما ہیں زیست کی ناموافقت کے تمام تر شوخ وہاں موجود ہیں جس پر یہ سخن صادق آتا ہے بقول ابوالبیان ظہور احمد فاتح:

گو تم نے سچ کہا تھا
دنیا ہے گھر دکھوں کا

بقول ساحر لدھیانوی

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

غم کی آنچ شدید نوعیت کی ہے حیات کی ہزیمت کی ایک اجتماعی ہے جس میں غمِ الفت بھی

ہے اور غمِ معاش بھی بھر پور صورت میں ہویدا ہے جس سے مجموعی طور پہ یہ تاثر اجاگر ہوتا ہے کہ زندگی انھیں راس نہیں آئی بلکہ ایک جبر بن کر رہ گئی ہے لمحہ لمحہ دوزخ کا مثیل بن گیا ہے بایں وجوہ اُن کے افکار کی حدت خود میں ایک کشت سامانی رکھتی ہے جس کے سرد ہونے کا تصور ناممکنات کا حصہ ہے۔

اُن کا کلام سوز و گداز کی دولت سے مالامال ہے جن میں ہجر کی کیفیات اور قلبی واردات کا مزکور بھی ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں وصال رُت کا تصور ناپید نظر آتا ہے۔ ناکامیٔ الفت اُن کے لیے ایک لا دوا روگ ہے اس لیے محبوب کے حوالے سے اُن کے ہاں ایک نالہ و شیون کی روایت ملتی ہے اور ردِعمل کے طور پہ حزن و ملال فزوں تر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

دل کا یہ حال سوزِ ہجراں میں
موم بن کر پگھلتا رہتا ہے

جہاں اُن کے ہاں محبوب کے حوالے سے ڈھیر سے رویوں کی عکاسی ہوئی ہے وہاں اُن کا حزن و ملال بھی اُن کے محبوب کی عطا نظر آتا ہے جس کا اظہار وہ برملا انداز میں کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں یوں محبوب کی جفاؤں کا ایک نمایاں روپ عیاں ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

مجھے نڈھال کر گیا
صنم کمال کر گیا
دیے ہیں درد اس قدر
وہ مالامال کر گیا

اگرچہ یہ ایک اظہر من الشمس حقیقت ہے کہ اُن کی فکر حزنیہ و المیہ طرز سے عبارت ہے مگر اُن کے ہاں شاذ و شاذ رجائی خیالات بھی جلوہ نمائی کرتے نظر آتے ہیں اس لیے ہم یہ کہنے سے قاصر ہیں کہ اُن کے ہاں امید افزا اور طربیہ امکانات معدوم ہیں بلکہ انھیں بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

سرِ رہگزر ہونے والی ہے شاید
ابھی ہے نویدِ ملاقات باقی

☆

سنایا مژدۂ کرم
فزوں جمال کر گیا

بسا اوقات اُن کے ہاں حزن وطرب کے امتزاجی کوائف بھی پائے جاتے ہیں جس سے ایک معتدل ومتداول سوچ کی غمازی ہوتی ہے اور انتہا پسندی سے گریز کی ایک فطری صورت نظر آتی ہے۔

وہ سردیوں کی رات میں
سخن کو شال کر گیا
منا کے نکہتِ حزیں
وہ بے مثال کر گیا

☆

آہ اپنا بھی ساتھ کیسا ہے
جیسے ہو ساتھ دو کناروں کا

نکہتؔ عائشہ کا فکری کینوس ست روی سے محوِ ارتقا ہے۔ روایتی رومانوی موضوعات کے علاوہ اُن کے ہاں عصری رویوں اور عصری آشوب کی صدا اُن کے ہاں ایک بازگشت کی صورت سنائی دیتی ہے جو اُن کے وسیع تر تخیلاتی امکانات کی غمازی کرتی ہے۔

ابھی تک ہے آزارِ حالات باقی
سخن میں ہے عکسِ خیالات باقی

فانیؔ بدایونی اور شکیلؔ بدایونی کی طرح نکہتؔ کے سخن میں بھی یاسیت وقنوطیت کے مظاہر ملتے ہیں۔ انفرادی رویے کے طور پر ناقدریِ حیات کا پہلو بھی عیاں ہوتا ہے۔

مری روح کب کی فنا ہو چکی ہے
ذرا سی ہے اب مرگِ جذبات باقی
لحد پہ بہائیں گے وہ آ کے آنسو
یہ تقدیر کی ہیں کرامات باقی

دوسرے شعر کے مفہوم کو ایک اور مقام پر یوں واضح کیا ہے ذرا اُن کی غزل کا مقطع ملاحظہ فرمائیں۔

جب جنازہ مرا اُٹھا نکہتؔ
بے مروت وہ ہاتھ ملتا رہا

رومان میں تنقیدی رویوں کا ظہور جدید طرزِ فکر اور محبت میں ناکامی کا نتیجہ ہے جس میں صداقت پسندی اور جراُتِ اظہار کے خصائص پائے جاتے ہیں وفاؤں کی پاس داری اور جفاؤں کی عمل داری ایک کلاسیکی روایت کی پہچان بھی ہے۔

اپنی ہستی مٹا چکے ہم تو
بے وفاؤں سے پیار کیا رہتا
جھوٹ جو بولتے رہے ہر دم
اُن کا پھر اعتبار کیا رہتا

خود انتقادی ایک ایسا عمل ہے جس انسان سے کی بالیدہ فکری اور انصاف پسندی عیاں ہوتی ہے جس سے صداقتوں کی شگفتی نمایاں ہوتی ہے۔ خود کو موردِ الزام ٹھہرانا انسان کی بہت بڑی غیر جانب داری کا مصداق ہے۔

پاؤں اپنے لہو کیے میں نے
سر مرا زیر بار کیا رہتا

وہ عمومی سماجی رویوں کو ہدفِ تنقید بناتی ہیں اور انسانی کج روی کو بے نقاب بھی کرتی ہیں جس سے انسان دوستی کا آدرش ملتا ہے جو مکارمِ اخلاق کی بالواسطہ تعلیم و تربیت کا درجہ رکھتا ہے۔

حادثہ ہے یہ واقعہ تو نہیں
اُف بدل جانا جاں سے پیاروں کا

نکہتؔ عائشہ چاہتوں کو سراپا مسرت گردانتی ہیں اور حیات کی تمام تر خوش گواریوں کو اسی سے منسوب کرتی ہیں زیست کا فطری حسن بھی اسی سے نسبت رکھتا ہے۔ الفتوں کی عدم دستیابی ہر طرح کے حزن والم اور جبر و جور کو جواز فروغ بخشتی ہے۔

چاہتیں وہ نہیں رہیں نگہت
وقت پھر خوش گوار کیا رہتا؟

نگہت کا رنگِ سخن عمومی وروایتی احساسات کی سندرتا اور کوملتا شفاف وشستہ اسلوب لیے ہوئے ہے۔ ان کی شاعری میں عمومیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اس لیے قاری کو ان کے افکار اپنے ذاتی خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ حزن وملال کی حاشیہ آرائی میں اپنائیت کا بھرپور احساس اجاگر ہوتا ہے۔ ان کے سوانحی معاملات کے علی الرغم ایک دردِ مظلومیت ہویدا ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کا مقصودِ شاعری ادب میں مقام ومرتبت اور شہرت ومنزلت کا حصول ہرگز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کو طباعتی مواقع خاطر خواہ طور پر میسر نہیں آئے۔ سخن سازی ان کے لیے محض ایک کتھارسس کا ذریعہ ہے۔ ان کے بے پایاں غم والم کا اظہار ہے جو وہ اہلِ جہاں پر منکشف کرنا چاہتی ہیں۔

جیسا کہ ہم نے قبل ازیں رقم کیا ہے، ان کی شعر گوئی کا مدعا ومنتہا ادبی مقاصد کی بازیافت نہیں، اس لیے ان کے ریاضِ شعر کو عرصۂ نوآموزوں پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ان کے فکری وفنی ادراکات انتہائی معصوم اور ابھی نقطۂ آغاز پر ہیں۔ انھیں مستقل ومعتبر راہنمائی مطلوب ہے۔ اگر ان کا ذوق وانہماک روبہ ارتقا رہا تو مزید معیارات کی بازیافت کا عمل ان کے لیے سہل تر ہو جائے گا جس کے لیے شعر سازی کی طرف مخلصانہ مراجعت مندوب ومستحسن ہوگی۔

○

# غزل

نگہتؔ عائشہ، کراچی

ذرا تو جینے کی امید چارہ گر ہوتی
تری نظر ہی سہارا مرا اگر ہوتی

اگر نہیں تھی محبت تو کوئی بات نہیں
حضور آپ کی نفرت ہی معتبر ہوتی

مرے دیار میں ہیں دائمی اندھیرے کیوں
کبھی تو رات گزرتی کبھی سحر ہوتی

مرا رفیق نہ مجھ سے کبھی جدا ہوتا
کوئی تو وصل کی تدبیر کارگر ہوتی

تمھارا ساتھ چلو مختصر سہی لیکن
کرم یہ ہوتا محبت نہ مختصر ہوتی

حیات جیسے کسی غار میں بسر کی ہے
کوئی تو نکہتِؔ جاں صورتِ سفر ہوتی

# غزل

نگہتؔ عائشہ، کراچی

کی اُس نے ہیں مجھ پہ جو عنایات مسلسل
اب دل کو دُکھاتی ہے یہی بات مسلسل

اب وصل کی کوئی تو کرامات کرو تم
منظور نہیں ہجر کی سوغات مسلسل

کوئی تو گھڑی تم کبھی فرصت کی نکالو
لازم نہیں ہر بار ہو اک بات مسلسل

آنکھوں سے چھلکتا ہے یہ دل جام کی صورت
سینہ ہے کہ جیسے ہو خرابات مسلسل

اک میں ہوں کہ جیسے کوئی دریائے محبت
لیکن ہے صنم پیکرِ آفات مسلسل

اک بار جنھیں چھو لیا اُس لمسِ کرم نے
سرشار پسِ مرگ ہے وہ بات مسلسل

ہر بار لہو تھوکا ہے نگہتؔ نے تمھاری
ہوتے رہے ویسے تو کمالات مسلسل

# ہما اعظمی اور عصری رویّے

ہر اہلِ قلم اپنے عہد سے اثرات قبول کرتا ہے اور اثرات مرتب بھی کرتا ہے اس لیے اُس کے تخلیق کردہ ادب میں روحِ عصر اور عصری رویے آشکار ہوتے ہیں یوں وہ ترجمانِ عصر قرار پاتا ہے اور عصری مزاج کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے شذرہ ھٰذا میں ہم ہما اعظمی کی سخن سازی کے حوالے سے خامہ فرسا ہیں جن کی شاعری میں عصری رویّوں کی ترجمانی وفور سے پائی جاتی ہے۔ ان کا اصل نام حمیرا نذیر ہے لیکن دنیائے ادب میں ہما اعظمی کے نام سے معروف و مقبول ہیں جنھوں نے کراچی میں جنم لیا لیکن اُن کے آبا و اجداد کا مولد و مسکن اعظم گڑھ بھارت ہے یہ وہ فرخندہ نصیب خطۂ ارضی ہے جس میں علامہ شبلی نعمانی، فضا ابن فیضی، فہیم اعظمی، انجم اعظمی، ابواللیث قریشی اور شکیل الرحمن جیسے ادب کے جلیل القدر سپوتوں کو اپنے بطن گیتی سے جنم دیا ان کے والد گرامی کا نام نذیر احمد اعظمی اور شبیر احمد انصاری مرحوم ان کے دادا تھے مختیار اجمیری، غالب عرفان اور پروفیسر سحر انصاری کی آرا کتاب ھٰذا کا حصہ ہیں غزلیات کے منتخب اشعار برائے تجزیات و استخراجات شاملِ شذرہ ہیں۔

دنیائے عشق کی تاریخ اس قدر قدیم ہے جس طرح بنی نوع انسان کی تاریخ پرانی ہے عشق وہ شجر بے مرگ ہے جو ہر عہد میں رو بہ زوال رہ کر اپنی بقا کی جنگ لڑتا رہا ہے اس سلسلے میں اسے بے انت کٹھنائیوں کے سفر سے گزرنا پڑا بدنامیاں اور رسوائیاں سدا جس کا مقدر رہی ہیں لیکن ہما اعظمی کا کمالِ فن دیکھیے کہ انھوں نے اس عصری رویے کو تعلیاتی تناظر میں پیش کیا ہے۔

ہم عاشقوں نے دل سے ہر دور میں خریدا
بدنامیوں کا ساماں ، رسوائیوں کا سودا

اُن کے فحوائے کلام میں اپنے محبوب اور قاری کے لیے پند و موعظت کا عمومی پہلو ملتا ہے جس سے یہ امر اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ اُن کی فکر خیر خواہی کے زیور سے مرصع ہے جو ایک گراں مایہ عصری رویے کی مثیل ہے اور انسان دوستی کی دلیل ہے۔

دیکھنا سر کی حفاظت سے نہ غافل رہنا
لوگ جس وقت بھی ہاتھوں میں اُٹھائیں پتھر

ہما کی شاعری میں درد و غم سے مفر کا پہلو مفقود اور موانست کا جذبہ موجود ہے۔ یہی امر اُن کی نیرنگیٔ فکر کا جواز ہے جس میں کلاسیکیت کا ایک رچاؤ جسے زندگی سے محبت کا امر جذبہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

دل کی چاہت ہے کہ سینے سے لگا لو ان کو
اب یہی درد تو جینے کا مزا دیتے ہیں

ہما اعظمی کے ہاں روایتی افکار و خیالات کا فلسفیانہ اور حسیاتی استخدام انتہائی عمدگی کے پیرائے میں ملتا ہے جس کے علی الرغم ایک عام سا موضوع بھی خصوصی اہمیت اختیار کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے انھیں جیون اور سنسار میں غم و الم کی راجدھانی نظر آتی ہے جس سے اُن کی حزنیہ شعری طبع کی غمازی ہوتی ہے وفورِ حزن میں انھیں غمِ ذات عزیز تر اور پیش رفت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے یوں اُن کا انفرادی حوالہ نمایاں ہو جاتا ہے جو قاری کو اپنے دکھ کی بپتا معلوم ہوتی ہے۔

کون یہاں پر دُکھ بانٹے گا سب کے اپنے افسانے ہیں؟
اپنا دُکھ تو اپنا ہے بس یہ دنیا بیگانی سی

انھوں نے اپنی شعریات میں اپنے عہد کو بلا تصنع سمونے کی سعیِ بلیغ کی ہے جس میں وہ بخوبی کامیاب ہوتی ہیں انھوں نے اپنے دور کے ایسے کرداروں کی ترجمانی کی ہے جنھیں بالعموم لائقِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا ان کے ہاں الفاظ و خیالات کا غیر ضروری پہلو عنقا ہے جو اُن کی بالیدگیِ فکر و فن کی لازوال نظیر ہے۔

آوارہ پھرا کرتا ہے اُن کا ہی تخیل
بکھرے ہوئے گیسو جو سنوارا نہیں کرتے

ہما کے سخن میں اخلاقی وسماجی اقدار کونمو میسر ہے محبت وہمدردی کے احساسات اپنائیت کو جنم دے رہے ہیں جوانسان دوستی کا درسِ زریں ہے۔

رشتے ناتے سب چھوٹے ہیں بس اتنی سی بات ہما
وہی تو اپنا ہوجاتا ہے جس نے درد بٹایا ہے

شاعرہ موصوفہ ایک دردمند دل رکھتی ہیں اور خودکو دردمند جذبوں کا امین سمجھتی ہیں انھیں اپنے عہد اور سماج کے فکری وذہنی ارتقا کی فکر دامن گیر رہتی ہے اس لیے وہ اپنے قاری کو توجہ طلب امور کی طرف متوجہ کرتی ہیں علمی وادبی زبوں حالی پر اُن کا دل کُڑھتا ہے اس لیے وہ زوال پذیر معاشرت کے مصائب کی نشان دہی کرتی ہیں جس کا سب سے بڑا سبب علم وادب سے دوری ہے۔

ہم دیکھا کیے اور یہاں اُڑتی رہی دھول
اس بار کتابوں پہ بہت گرد گی ہے

اُن کے افکار میں خلوص ومروت کی فضا ہے جن میں مسرت وتمکنت اور امیدافزا امکانات ملتے ہیں وہ ایک رجائیت پسند شاعرہ ہیں اور کسی نوع کی قنوطیت سے اُن کی شخصیت کا بیماری پہلو سامنے آتا ہے وہ زندگی میں بیم ورجا پر یقین رکھتی ہیں اس لیے وہ شاکر وقانع نظر آتی ہیں۔

میں اپنی آنکھ میں سپنے سجا کر سب سے ملتی ہوں
دلاسے مجھ کو ملتے ہیں خوشی بیم و رجا میں ہے

ان کے فکری کینوس میں محبت کا آفاقی پہلو ملتا ہے جو عصرِ حاضر کی کسی بھی شاعرہ کے ہاں شاذ ہی پایا جاتا ہے یہی امر اُن کے تخیلات تقدس وتطہیر کی علامت ہے جو نسائی شاعری میں نایاب تو نہیں البتہ کمیاب ضرور ہے۔

زندگی کا یہ تقاضا ہے جہانِ عشق میں
ہر کسی کو ہر کسی سے پیار ہونا چاہیے
جسم تو کچھ بھی نہیں خاک کا اک ڈھیر ہے
روح کو ہی عشق سے سرشار ہونا چاہیے

عصری آشوب کی بازگشت بھی اُن کے شعری رویوں میں بہ خوبی ملاحظہ کی جا سکتی ہے اُن کی فکر اپنے عہد کے شعری مزاج کی بھرپور غمازی سے مملو ہے۔

نہ چین دن میں سکوں نہ شب میں یہی ہے حالت کئی دنوں سے
بکھر چکا ہے وجود اپنا عجب قیامت کئی دنوں سے

ہماؔ اعظمی کا کلام اپنے عہد کے تلخ و شیریں رویوں سے عبارت ہے اور عصرِ حاضر کے شعری رویوں کی سُندرتا اور کوملتا کے پہلو بہ پہلو خوش گوار و ناخوش گوار تجربات و مشاہدات ملتے ہیں مزید براں ریاضِ شعر اُن کے فکر و فن کو بالیدگی سے ہم آغوش کرنے کے ساتھ ساتھ اُنھیں مقامِ اعتبار سے بھی نوازے گا۔

◆

# غزل

ہما اعظمی، کراچی

اُس نے غرض کے ساتھ بڑھائے تھے اپنے ہاتھ
کچھ سوچ کر بھی ہم نے ملائے تھے اپنے ہاتھ

وہ شاخ ٹوٹ کر بھی تو رشکِ چمن رہی
جس شاخِ گل کو اُس نے لگائے تھے اپنے ہاتھ

پروانہ جل چکا تو بھڑک اٹھی شمع اور
دیوانے نے بھی بڑھ کے جلائے تھے اپنے ہاتھ

رنگِ حنا سمجھتی ہے دنیا اُسے مگر
اپنے لہو سے ہم نے سجائے تھے اپنے ہاتھ

سورج بدن وہ شخص دہکتا رہا ہما
اور چلچلاتی دھوپ میں سائے تھے اپنے ہاتھ

# غزل

### ہمؔا اعظمی، کراچی

چلتے چلتے راستے میں قربتیں مل جائیں گی
گر مقدر میں ہوئیں تو راحتیں مل جائیں گی

اپنے ہونٹوں کو تبسم کی جلا ملتی ہے کب؟
چشمِ پرنم ہے جہاں سے لذتیں مل جائیں گی

اپنے سینے سے لگا لو ان کہے لفظوں کی آن
خوش نصیبی کی ہمیں بھی ساعتیں مل جائیں گے

اپنے شعروں میں روانی ہو دعاؤں کے طفیل
واسطے حمد و ثنا کے آیتیں مل جائیں گے

دل ترا کیوں مضطرب ہے کس کی چاہت ہے تجھے؟
زندہ رہنے کی طلب میں وحشتیں مل جائیں گی

ایک موسم کی طلب میں الفتِ پرواز ہے
خوش رہے گی جب ہمؔا تو ہجرتیں مل جائیں گی

# شبیر ناقدؔ کے سوانحی وفنی کوائف پر طائرانہ نظر

**شاعر علی شاعرؔ** (کراچی)

اصل نام غلام شبیر اور ادبی نام شبیر ناقدؔ ہے یکم فروری 1975ء کو جنوبی پنجاب کے مردم خیز خطے ڈیرہ غازی خاں کی تحصیل تونسہ شریف کے گاؤں ہیرو شرقی میں پیدائش ہوئی عہدِ طفولیت میں ہی فطری طور پر طبیعت لکھنے پڑھنے کی طرف راغب ہوئی گویا علم و ادب کا ذوق مشیت سے ودیعت ہوا عام بچوں کی طرح کھیل کود کے مشاغل میں ان کی دلچسپی انتہائی کم رہی لیل و نہار کا بیشتر حصہ حصولِ علم میں صرف ہوا میٹرک کا امتحان 1992ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول ہیرو شرقی سے امتیازی نمبروں میں پاس کیا 1994ء میں گورنمنٹ کمرشل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ تونسہ شریف سے ڈی کام کیا زمانۂ طالب علمی میں اپنے اساتذہ کے منظورِ نظر رہے شاعری کا باضابطہ آغاز تو نویں جماعت سے ہی ہو گیا تھا اولاً انگریزی، اردو، سرائیکی اور پنجابی زبان میں طبع آزمائی کی۔ Beauty، ٹیپو سلطان اور حریت اس دور کی معرکۃ الآرا نظمیں ہیں لیکن سخن سازی کا باضابطہ آغاز 1995ء میں کیا اور ادبی فیض استاذ الشعرا ابوالبیان ظہور احمد فاتحؔ سے پایا شبیر ناقدؔ کا شمار پروفیسر ظہور احمد فاتحؔ کے ان تلامذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے آموزگار ادب سے سب سے زیادہ اکتساب فیض کیا ہے اس لیے انہیں ممتاز و منفرد مقام حاصل ہے ان کی بسیار گوئی بھی اپنے استاذِ محترم سے کچھ نہ کچھ حد تک مماثلت رکھتی ہے ان کی پرگوئی کا یہ عالم ہے کہ ان کے ابھی تک تین مجموعہ ہائے کلام زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں لیکن ان کے غیر مطبوعہ کلام سے ایک درجن شعری مجموعے با آسانی ترتیب پا سکتے ہیں زبان و ادب کی خدمت کو احساس سود و زیاں سے بالاتر ہو کر روح کی ریاضت گردانتے ہیں اس لیے بلا امتیازِ شام و سحر گلشنِ شعر و ادب کی آبیاری

میں منہمک رہتے ہیں ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے ان کے معمولات ادبی خدمات سے عبارت ہیں ادبی اعتبار سے ملک گیر رابطوں کے حامل ہیں اگر کوئی تلمیذِ ادب راہ نمائی کا خواستار ہو تو بصد خلوص اس کی حاجت کشائی کرتے ہیں ان کے شب و روز ان کی ادب سے وابستگی کے جنون کی حد تک غماز ہیں گویا شبیر ناقدؔ راہِ ادب کے ان تھک راہی ہیں جو خلوص اور ریاضت پہ یقین رکھتے ہیں اس سلسلے میں وہ اپنے آرام اور صحت کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

جولائی 1999ء میں انہوں نے پاک آرمی میں شمولیت اختیار کی تادمِ تحریر خدمات سر انجام دے رہے ہیں ان کی شخصیت کی متنوع خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ صاحبِ سیف بھی ہیں اور اہلِ قلم بھی۔ یہ اعجاز و افتخار شاذ ہی کسی کے حصے میں آتا ہے 2001ء کو بی اے کا امتحان بہاوالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے نجی طور پہ پاس کیا 2003ء کو جامعہ ھذا سے اردو ادبیات میں ایم اے کیا اور 2007ء کو مذکورہ یونیورسٹی سے پنجابی ادبیات میں ایم اے کیا۔

دسمبر 2007ء میں ان کا اولین شعری مجموعہ ”صلیبِ شعور“ جو غزلیات و نظمیات پہ مشتمل تھا منصۂ شہود پہ آیا کتاب ھذا کا وصفِ خاص یہ ہے کہ اس میں اردو ادب کی طویل ترین غزل جسے ”غزل نامہ“ سے موسوم کیا گیا ہے بھی شامل ہے لفظ ”غزل نامہ“ بھی ان کی ذاتی اختراع ہے۔ یہ غزل ایک سو اٹھتیس اشعار پہ مشتمل ہے جس میں قوافی کا تکراری پہلو معدوم ہے اور فکری اعتبار سے کثیر الموضوعات بھی ہے حیات و کائنات سے متعلق اکثر و بیشتر موضوعات اس میں شامل ہیں اپریل 2010ء میں ان کا سرائیکی مجموعۂ کلام ”من دی مسجد“ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا جس میں غزلیں، نظمیں، گیت، قطعات اور دوہڑے شامل تھے اپریل 2011ء میں ان کا دوسرا اردو مجموعۂ کلام اور مجموعی طور تیسری کتاب ”آہنگِ خاطر“ منظرِ عام پہ آئی جس میں نظم کی بیشتر ہیئتوں اور غزلوں پہ طبع آزمائی کی گئی ہے۔ نظم کے پہلو بہ پہلو نثر میں بھی ریاضت تواتر سے جاری و ساری ہے ان کی شعری و نثری تخلیقات ملک بھر کے ادبی جرائد اور اخبارات و رسائل کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ تصنیفی اعتبار سے شبیر ناقدؔ کے لیے 2013ء کا سال بھرپور ثابت ہوا جس میں ان کی چار تنقیدی نوعیت کی تصانیف منصۂ شہود پہ آئیں کتاب ھذا کی طباعت کے عمل کا آغاز بھی 2013ء کے اواخر میں ہوا جون 2013ء میں نثری اور تنقیدی نوعیت کی تصنیف ”ابوالبیان ظہور

احمد فاتح کا کیفِ غزل" سے موسوم زیورِ طباعت سے ہم آغوش ہوئی جس میں انہوں نے اپنے استادِ گرامی پروفیسر ظہور احمد فاتح کی شخصیت اور ان کے دس شعری مجموعوں کی مشمولہ غزلیات کا انتہائی منطقی اور استدلالی انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے جس میں ان کے نقدِ فن کا جوہر کھل کر سامنے آیا ہے اور تخلیقیت کی سطح بھی اجاگر ہوئی ہے جون 2013ء میں ہی "شاعراتِ ارضِ پاک" حصہ اوّل سے معنون تنقیدی مضامین و منتخب کلام مجموعہ شائع ہوا جس میں دو درجن شاعرات کے حوالے سے تنقیدی شذرات شامل ہیں جس میں نقادِ عصر شبیر ناقد نے اپنی تنقیدات کے جوہر دکھائے ہیں اکتوبر 2013ء میں شاعراتِ ارضِ پاک کے تاریخی ادبی سلسلے کی دوسری کڑی کے طور پر شاعراتِ ارضِ پاک حصہ دوم منظرِ عام پر آئی جبکہ نومبر 2013ء میں مذکورہ سلسلہ کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا اور اس کے بعد چار، پانچ ایڈیشن مزید سامنے آئے اور اب یہ چھٹا ایڈیشن یعنی "شاعراتِ ارضِ پاک" ششم آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کی من حیث المجموع تصانیف کو علمی و ادبی حلقوں میں نگاہِ استحسان سے دیکھا جاتا ہے انہیں بہت ہی قلیل عرصے میں بے پناہ مقبولیت و پذیرائی میسر آئی جو، ان کی شبانہ روز محنت شاقہ کا ثمر ہے نیٹ کے قارئین "اردو سخن ڈاٹ کام" پر ان کی تصانیف سے استفادہ اور اکتسابِ فیض کر سکتے ہیں۔

آج کل شبیر ناقد پاکستان کی شاعرات پر مزید تنقیدی و تحقیقی نوعیت کا کام کر رہے ہیں اس سلسلے میں "شاعراتِ ارضِ پاک" کے چھ ایڈیشن چھپ کر قارئین شعر و ادب سے خراجِ تحسین کی دولت سمیٹ چکے ہیں ان کے مضامین میں تحقیق کی نسبت تنقید کا عنصر غالب رہتا ہے گویا ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ شبیر ناقد اسم بامسمیٰ ہیں وہ ایک روکھے پھیکے ناقد نہیں بلکہ فطری نقاد ہیں مشیت نے انہیں طبیعت ہی تنقیدی نوعیت کی ودیعت کی ہے حتیٰ کہ ان کے کلام اور گفتگو میں بھی ناقدانہ افکار وفور سے ملتے ہیں کتاب ھذا متعدد تنقیدی شذرات کا مخزن ہے جس میں ادب کی مختلف اصناف سے تعلق رکھنے والی شخصیات کی تصانیف کے حوالے سے معروضی، منطقی اور استدلالی انداز میں خامہ فرسائی کی گئی ہے جسے شبیر ناقد کی مخصوص ناقدانہ حاشیہ آرائی نے چار چاند لگا دیئے ہیں اس کتاب کے مطالعہ کے بعد قارئین اور اربابِ دانش مصنف موصوف کی عرق ریزی کا اندازہ بخوبی لگا پائیں گے انہوں نے اپنے ہر شذرے کے آغاز میں کسی فنی یا سماجی مسئلے

کو موضوعِ بحث بنایا ہے جس سے ان کی فکر وفن سے فطری وابستگی کی عکاسی ہوتی ہے فطری اعتبار سے وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں لیکن ادب برائے ادب کی شمعیں بھی فروزاں نظر آتی ہیں ان کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ تخلیق کار اپنی تخلیقات میں روحِ عصر کی بھرپور غمازی کریں سماجی مسائل اور عمرانی خبائث کا مداوا تلاش کریں جو ایک حقیقی تخلیق کار کا اولین فرضِ منصبی ہے اور وہ اس سے عہدہ برا بھی ہو سکتا ہے ان کی تنقیدی حوالے سے درج ذیل کتب زیرِ طبع ہیں:

۱۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ ہفتم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام
۲۔ شاعراتِ ارضِ پاک (جامع ایڈیشن حصہ اول)
100 شاعرات کے حوالے سے شذرات اور منتخب کلام
۳۔ میزانِ تنقید (تنقیدی مضامین)
۴۔ تجزیات (تنقیدی مضامین)
۵۔ توضیحات (تنقیدی مضامین)
۶۔ زاویے (تنقیدی مضامین)
۷۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا منشور نظم (نظمیاتی تجزیہ)
۸۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح فکر و فن کے آئینے میں (غزلیات و منظومات کا تجزیہ)
۹۔ تنقیدات (تنقیدی مضامین)

علاوہ ازیں بچوں کے لیے شاعری بھی کرتے ہیں ان کا کلام ملک بھر کے بچوں کے جرائد کی زینت بھی بنتا رہتا ہے شبیر ناقدؔ نے بہت ہی کم عرصے میں اپنے آدرش میں بے پناہ وسعت پیدا کی ہے تخلیق و تنقید دونوں میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے طبعاً سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں مگر بے تکلفی انھیں بہت مرغوب ہے۔ انھیں یہ اعزاز و افتخار حاصل ہے کہ ان کی حیات پر سعیِ علمی و ادبی اور عسکری خدمات میں صرف ہو رہی ہے۔

الغرض شبیر ناقدؔ راہِ ادب کے ایک ان تھک مسافر ہیں جو خلوص، محبت اور لگن کے اصول ثلاثہ پر یقین رکھتے ہیں ریاضت جس کا کلیدی تلازمہ ہے رب ادب سے استدعا ہے کہ ان کے فکر و فن کو دولتِ دوام سے نوازے۔ آمین

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

# شبیر ناقد کی دیگر تصانیف

## شاعری

۱۔ صلیبِ شعور (غزلیات و نظمیات)

۲۔ من دی مسجد (سرائیکی شاعری)

(غزلیں، نظمیں، گیت، قطعات، دوہڑے، سرائیکو)

۳۔ آہنگِ خاطر (غزلیات، نظمیات، گیت، قطعات، ہائیکو)

۴۔ جادۂ فکر (غزلیات و نظمیات)

۵۔ سنجِ کاوش (غزلیات و نظمیات) زیرِ طبع

۶۔ دل سے دور نہیں ہو تم (غزلیات و نظمیات) زیرِ طبع

۷۔ کتابِ وفا (غزلیات و نظمیات) زیرِ طبع

۸۔ روح دی روہی (سرائیکی شاعری) زیرِ طبع

(غزلیں، نظمیں، قطعے، دوہڑے) سرائیکو زیرِ طبع

## تنقید

۱۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا کیفِ غزل

(سوانحی و فنی مطالعہ اور غزل کا انتقادی جائزہ)

۲۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ اول) تنقیدی مضامین و منتخب کلام

۳۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ دوم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام

۴۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ سوم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام

۵۔ شاعراتِ ارضِ پاک (حصہ چہارم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام

۶۔ شاعرات ارض پاک (حصہ پنجم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام

۷۔ شاعرات ارض پاک (حصہ ششم) تنقیدی مضامین و منتخب کلام

۸۔ شاعرات ارض پاک (حصہ ہفتم) زیر ترتیب

۹۔ شاعرات ارض پاک (جامع ایڈیشن، حصہ اول) زیر طبع

100 شاعرات کے حوالے سے شذرات و منتخب کلام

۱۰۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح کا منشور نظم

(ظہور احمد فاتح کی نظم کا تنقیدی جائزہ) زیر طبع

۱۱۔ میزان تنقید (تنقیدی مضامین) زیر طبع

۱۲۔ تنقیدات (تنقیدی مضامین) زیر طبع

۱۳۔ ابوالبیان ظہور احمد فاتح فکر و فن کے آئینے میں زیر طبع

(غزلیات و منظومات کا تجزیہ)

۱۴۔ توضیحات (تنقیدی مضامین) زیر طبع

۱۵۔ زاویے (تنقیدی مضامین) زیر طبع

۱۶۔ تجزیات (تنقیدی مضامین) زیر طبع

☆☆☆☆☆